خصوصی نمبر:
مورخ اہل حدیث
# مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب و سنّت کا داعی اور مسلک سلف کا پاسبان

# ترجمان جدید

پندرہ روزہ

نئی دہلی

www.KitaboSunnat.com

## میرا نقطۂ نظر:

میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جس شخصیت کے بارے میں لکھا جائے، اس کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا جائے جن سے لکھنے والا بالواسطہ یا بلاواسطہ مطلع ہوا، تاکہ اس کی شب و روز کی سرگرمیوں سے زیادہ سے زیادہ گوشے نکھر کر قارئین کے سامنے آسکیں اور ان کی مدد سے اس کی عادات واطوار اور گفتار و کردار کا صاف طور سے مشاہدہ کیا جا سکے، چنانچہ شخصیات سے متعلق میں اسی انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

محمد اسحاق بھٹی

(نقوشِ عظمتِ رفتہ: ص:۷)

جلد نمبر: ۳۰-۴ یکم جون تا ۳۰ نومبر ۲۰۱۶ء مطابق ۲۴ رشعبان ۱۴۳۷ تا ۲۹ رصفر ۱۴۳۸ھ شمارہ: ۱۹-۲۴ / ۱-۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

# محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

درس قرآن

## قرآنی طریقۂ طلاق اور شریعت پر نشانہ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌ بِاِحۡسَان....الخ (البقرہ:۲۲۹)

**ترجمہ:** طلاق دو مرتبہ ہیں پھر یا تو اچھائی کے ساتھ روکنا یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔

**تفسیر:** مذکورہ آیت میں قرآنی طریقۂ طلاق کو اللہ نے اپنی آخری کتاب میں واضح کیا ہے نیز مختلف سورتوں میں اس کا تذکرہ کر کے طریقہ بتایا ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو جس کام کا بھی حکم دیا یا جس چیز سے منع کیا ہے اسی میں راحت و آسانی ہے، مثلا نکاح کا طریقہ مشروع کیا اس میں حلال طریقہ سے نسلِ انسانی کی افزائش و بے شمار فوائد ہیں لیکن زوجین کے اختلاف کی صورت میں طلاق کو بھی مباح قرار دیا ہے۔

طلاق کے لغوی معنی ہیں عورت کا شوہر کے قید نکاح سے جدا ہو جانا، اس کو چھوڑ دینا، یعنی جب زوجین کے درمیان کسی معقول بنیاد پر ایسا اختلاف ہو جائے جس کی وجہ سے دونوں کا ایک ساتھ زندگی گزارنا دشوار ہو، افہام و تفہیم غیر موثر ہو جائے تو ایسی صورت میں شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے کر رخصت کر دے۔ اس میں بھی شریعت نے یہ طریقہ مقرر کر رکھا ہے کہ جب یہ نازک معاملہ پیش آئے تو خوب غور و فکر اور دونوں اپنے خیر خواہوں سے صلاح و مشورہ کر لیں کیونکہ طلاق سے حالات پراگندہ اور افرادِ خاندان منتشر ہو جاتے ہیں۔

طلاق شرعی کا طریقہ یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو حالت طہر میں ایک طلاق دے، جس میں صحبت نہ کی ہو، طلاق کے بعد اسے اپنے گھر میں رکھے۔ اگر اس درمیان دونوں میں بات بن جاتی ہے اور یہ اختلاف ختم ہو جاتے ہیں تو شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے، لیکن اگر پہلی مدت (ایک حیض) ختم ہو جاتی ہے اور ناگواری کی صورت باقی رہتی ہے تو پہلی طلاق کے طور پر دوسری بار طلاق دے اور اس دوسری طلاق کے بعد بھی شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے اور اگر دوسری کے بعد حالات میں سدھار نہ ہوا تو تیسری طلاق دے اس آخری طلاق کے بعد عورت اپنے شوہر کے لیے حرام ہو جاتی ہے اور رجوع کی اجازت نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ کسی اور سے شادی نہ کر لے اور یہ شوہر بھی کسی وجہ سے طلاق دے یا اس کا انتقال ہو جائے۔ آخری طلاق کے بعد عدت گزارے اور سابقہ شوہر سے نکاح جدید کے ساتھ واپس آسکتی ہے، یہی ہے طلاق کا قرآنی مسنون طریقہ جس کی شریعت نے تمام مسلمانوں کو تعلیم دی ہے۔

زمانہ جاہلیت میں طلاق و رجوع غیر محدود تھا آدمی بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا اللہ نے اس ظلم کے راستہ کو بند کر دیا اور پہلی دوسری بار سوچنے اور گھر بسانے کی سہولت سے محروم بھی نہیں کیا ورنہ پہلی مرتبہ میں ہی ہمیشہ کے لیے جدائی کا حکم دے دیا جاتا۔ گزشتہ دنوں سپریم کورٹ میں تین طلاق سے متعلق کچھ مسلم خواتین نے دعوی دائر کیا ہے تب سے میڈیا میں ایک نئی بحث چھڑ گئی ہے جب کہ طلاق کا صحیح طریقہ اللہ نے واضح کر دیا ہے۔

ضرورت ہے کہ اسی طریقۂ طلاق سے عوام کو روشناس کرایا جائے تاکہ صحیح اسلام کی تعلیم پر عمل کر کے لوگ ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہ سکیں اور کسی کو اسلامی قوانین میں بے جا مداخلت کا بہانہ نہ ملے۔

اللہ رب العالمین ہمیں صحیح دین اسلام یعنی کتاب اللہ اور سنت نبوی کی اتباع کرنے کی توفیق سے نوازے، آمین

درس حدیث

## صدقۂ جاریہ کا ثواب وفات کے بعد بھی

عَنۡ أَبِی هریرۃ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ إنَّ مِمَّا يَلۡحَقُ الۡمُؤمِنَ مِنۡ عَمَلِهٖ وَ حَسَنَاتِهٖ بَعۡدَ مَوۡتِهٖ عِلۡماً عَلِمَهٗ وَنَشَرَهٗ وَوَلَدًا صَالِحاً تَرَكَهٗ، أَوۡ مُصۡحَفًا وَرِثَهٗ أَوۡ مَسۡجِدًا بَنَاهٗ أَوۡ بَيۡتًا لِابۡنِ السَّبِيۡلِ أَوۡ نَهۡرًا أَجۡرَاهُ الخ (رواہ ابن ماجه، حسنه الألبانی)

**ترجمہ:** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ مومن کے عمل اور اس کی نیکیوں سے جو چیزیں اس کے مرنے کے بعد بھی پہونچتی ہیں وہ شرعی علم ہے جسے اس نے سیکھا اور اس کی اشاعت کی اور صالح اولاد اپنے پیچھے چھوڑا ہو، یا قرآن مجید وراثت و ترکہ میں چھوڑا ہو یا کوئی مسجد بنائی ہو، یا سرائے و مدرسہ قائم کیا ہو یا نہر کھودوائی ہو، یا اپنے مال میں سے اپنی زندگی میں بحالت صحت ایسا صدقہ جاریہ کیا ہو، جس کا ثواب مرنے کے بعد بھی اسے پہونچتا رہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: إذا مات الانسان انقطع عمله إلا من ثلاث.الخ

جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب مر جاتا ہے تو اس کے اعمال ختم ہو جاتے مگر تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے، وہ ہیں: صدقۂ جاریہ، اولاد صالح، ایسا علم جو نفع بخش ہو۔

یہی وہ صدقہ و خیرات ہیں جن کا سلسلہ زندگی میں جاری تھا، مگر روح قفص عنصری سے پرواز کرنے کے بعد سارے اعمال ختم ہو جاتے ہیں لیکن کچھ نیک اعمال و دینی خدمات ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کے مرنے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں اور اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتے رہتے ہیں، اسی کو حدیث مذکور میں صدقۂ جاریہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس کی مختلف صورتیں ہیں سب سے مقدم علم دین کا سیکھنا اور اسے مختلف ذرائع سے پھیلانا، مثلا دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دین کی اشاعت کرنا دوسرے نیک و صالح اولاد کو اپنے پیچھے چھوڑ جانا وہ جو نیک کام کریں گے اس کا اجر و ثواب والدین کو ملتا رہے گا۔

اسی قبیل سے مصحف و دینی کتب کا ترکہ ہے یعنی کوئی شخص اپنی زندگی میں کوئی مفید کتاب مثلا قرآن کی تفسیر اور حدیث کی شرح یا کوئی اور مفید کتاب تصنیف کرتا ہے اور لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں، تو ایسے شخص کو اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا ثواب ملتا رہے گا۔ اسی طرح سے مسجد و مدرسہ کی تعمیر سرائے و مسافر خانہ اور شیریں پانی کے لیے کنواں اور نل کا انتظام کرنا ہے کہ مرنے والے کو مرنے کے بعد اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

البتہ تصنیف کتب و تعمیراتی کاموں کا ثواب بطور صدقۂ جاریہ کے زیادہ مستحکم اور عوام کے حق میں زیادہ نفع بخش اور پائیدار ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں آئے اور پوچھا کہ میری ماں فوراً مر گئی، اگر بولتی تو صدقہ دیتی، اگر میں اس کی طرف سے صدقہ دوں تو اسے ثواب ملے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

اس لیے صاحب حیثیت افراد کو ایسے کاموں کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے جو صدقۂ جاریہ بن سکیں اور مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب جاری رہے، اسی کے پیش نظر مولانا بھٹی پر یہ خصوصی نمبر شائع کیا جا رہا ہے امید کہ قارئین اسے بنظر استحسان دیکھیں گے۔

اللہ ہمیں بھی صحابہ کرام کی پیروی کرتے ہوئے صدقۂ جاریہ کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

عبدالمبین ندوی

کتاب وسنت کا داعی اور مسلک سلف کا پاسبان

# ترجمان جدید

پندرہ روزہ

نئی دہلی

جلد نمبر:۳ شمارہ:۱۹-۲۴
یکم جون تا ۳۰ نومبر ۲۰۱۶ء مطابق ۲۴ر شعبان ۱۴۳۷ تا ۲۹ر صفر ۱۴۳۸ھ
جلد نمبر:۴ شمارہ:۱-۶

مدیر مسئول :
صلاح الدین مقبول احمد

مدیر: رضاء اللہ عبدالکریم مدنی    نائب مدیر : عبدالمبین عبدالخالق ندوی

درس قرآن ودرس حدیث — ادارہ — ۲

**اداریہ:**

پہل ہوچکی، قدم اٹھ چکے — شیخ عبدالمعید مدنی — ۴

**مقالات:**

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے
صلاح الدین مقبول احمد — ۶

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ اور معاصر تذکرہ نگاری
شیخ عبدالمعید مدنی (علی گڑھ) — ۲۲

مؤرخ اہل حدیث: مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ
مولانا محمد انور قاسم سلفی (کویت) — ۲۷

مسلکِ حق کا ایک غیور مؤرخ
مولانا عبدالرزاق عبدالغفار سلفی (دبئی) — ۳۳

رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ — حافظ احمد شاکر (مدیر الاعتصام، لاہور) — ۳۷

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ: نقوش وتأثرات
مولانا عبدالرشید عراقی (کراچی) — ۴۰

تسبیح کا ایک اور موتی لڑی سے نکل گیا
پروفیسر عبدالعظیم جانباز (سیالکوٹ) — ۴۲

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی زندگی کے چند تابناک پہلو
مولانا راشد حسن سلفی مبارکپوری (نئی دہلی) — ۴۵

مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ یادوں کے چند نقوش
مولانا ابوبکر قدوسی (لاہور) — ۴۸

مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی گزر گئے
مولانا محمد تنزیل الصدیقی الحسینی (لاہور) — ۵۲

مسلک اہل حدیث کی متاع عزیز.....
مولانا محمد یوسف انور (فیصل آباد) — ۵۴

علم کا پہاڑ....انکسار کا پیکر — مولانا رانا شفیق پسروری — ۵۶

علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا
مولانا عبدالرؤف خان ندوی (تلشی پور) — ۵۷

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ کی خوراک (جسمانی، روحانی اور قلمی)
ڈاکٹر عبدالغفور راشد — ۵۸

علامہ محمد اسحاق بھٹی ماہ وسال کے آئینے میں
عبدالمبین ندوی — ۶۰

مؤرخ اسلام، محقق ودانشور، علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ سے ایک ملاقات
(بشکریہ میگزین نوید ضیاء) — ۶۲

سوانحی خاکوں میں مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کا اسلوب نگارش
یاسر اسعد (جامعہ سلفیہ بنارس) — ۷۱

میرے پیارے ابوجی (مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ)
سمیہ زیرک بھٹی — ۷۳

میرے مولانا (مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ)
محمد نعمان اسحاق — ۷۴

آہ! مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی گزر گئے، چند یادیں چند آثار
عرفان جعفر خان — ۷۵

مولانا بھٹی رحمہ اللہ کے انتقال پر تعزیتی پیغامات — (ادارہ) — ۷۶

**منظومات**

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی یاد میں (منظوم) — مقتلج نوشہروی — ۸۰

میں بارِ غم سے درِ حق پر سرخمیدہ ہوں (منظوم)
مولانا عتیق اثر ندوی (دریا آباد) — ۸۲

**جمعیت وجماعت**

''جمعیت اہل حدیث ہند'' آل انڈیا مشاورتی میٹنگ کی رپورٹ
نائب مدیر — ۸۳

**وفیات:** — ۸۶

**بدل اشتراک**

| | | |
|---|---|---|
| فی شمارہ | : | ۱۰ر روپے |
| سالانہ | : | ۲۰۰ر روپے |
| بلاد عربیہ ودیگر ممالک | : | ۳۵ر ڈالر یا مساوی |

**رابطہ کا پتہ:**

''ترجمان جدید'' E-57/1 ابوالفضل انکلیو-1 جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فون نمبر: 01126940804 Email:tarjumanejadeed@gmail.com

**نوٹ:** ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

اداریہ

# پہل ہو چکی، قدم اٹھ چکے

شیخ عبدالمعید مدنی

۳۱ جولائی ۲۰۱۶ء بروز اتوار، ریور ویو ہوٹل اوکھلا، دہلی میں جمعیۃ اہل حدیث ہند کی تنظیمی مشورتی میٹنگ ہوئی۔ اس میں اہم فیصلے ہوئے۔

اس میٹنگ میں شرکاء نے شدت سے محسوس کیا کہ ملک میں پھیلی ہوئی اہل حدیث آبادی کی ترقی وتحفظ اور دعوت کتاب وسنت کے فروغ کے لیے اجتماعی جدو جہد کی شدید ضرورت ہے۔ حالات کچھ ایسے بگڑتے جارہے ہیں کہ اگر اہل حدیث افراد اور اداروں کی رہنمائی نہ کی گئی اور ان کے اندر اجتماعی عمل کا رجحان نہ پیدا کیا گیا تو افراد اور اداروں کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ یہی دعوت کتاب وسنت کی طاقت ہیں ان کی سدھار حتمی ہے اس پہلو پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

کام کہاں سے شروع ہو یہ اہم سوال ہے؟ ظاہر ہے محض افراد کی فہرست بنانے اور انھیں کسی تنظیم کا رُکن بنانے اور رجسٹر میں نام درج کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اصل کام یہ ہے کہ افراد کی رہنمائی ہو، ان کی تربیت کی جائے، ان کی ذہن سازی ہو، ان کی سیرت وکردار کی تشکیل ہو، ان کے اندر دینی شعور پیدا کیا جائے، ان کو مساجد سے جوڑا جائے، برابران کو ربط میں رکھا جائے، ان کی خبر گیری ہو، دین کے فرائض کا انھیں پابند بنایا جائے، دین کی اشاعت اور ملت کی خدمت میں ان کو شریک کیا جائے، تب جاکر ان کا دینی رجحان بنے گا اور ان کو عملی زندگی ملے گی، برابران کو رہنمائی ملے گی اور ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔

اس کی خاطر اولاً دو عملی اقدام کی ضرورت ہے۔

۱۔ ایسے افراد کو اجتماعی دعوتی واصلاحی عمل سے جوڑا جائے جو دنیا کے سارے اعمال سے زیادہ اصلاحی ودعوتی عمل کو ترجیح دیں۔ ایسے افراد شروع میں کم ملیں گے لیکن اگر مسلسل اصلاحی ودعوتی کام کے لیے اٹھائے گئے قدم رکیں گے نہیں تو افراد جڑتے جائیں گے۔ کوششیں اگر جاری رہیں اور دین داری کا رنگ اگر نکھرتا گیا تو افراد جڑیں گے۔ جو افراد جڑیں ان کو مساجد سے جوڑا جائے۔ مساجد سے جڑنے اور جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان رسول پاک ﷺ کے فرمان ''فاشھدوا لہ بالایمان'' اس کے گواہ بن جاو کہ وہ۔ مساجد سے جڑے رہنے والے۔ ایمان والے ہیں کی فہرست میں آجائیں۔ مساجد سے صحیح معنوں میں جڑنے والے سچے مومن بن جاتے ہیں۔

۲۔ مساجد سے جڑنے پر انھیں پیغام ملے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی ترجیحی طور پر ڈھالیں۔ (الف) آؤ دین سیکھیں۔ (ب) آؤ دین پر عمل کریں۔ (ج) آؤ دین پھیلائیں۔

دراصل مسلم افراد اور سماج کو راہ رست اور راہِ نجات پر اسی طریقے سے لایا جا سکتا ہے، یہی اصلی راہ ہے۔ بقیہ دیگر کام کار دعوت کا تکملہ ہیں۔ یہ کام کرنے والے باشعور حساس اور دین کی اشاعت سے لگن رکھنے والے علماء یا دینی تعلیم یافتہ ہی کر سکتے ہیں۔

مساجد سے لوگ خود جڑیں یا ان کو میدان میں کام کرنے والے جوڑیں پھر وہ آؤ دین سیکھیں، آؤ دین پر عمل کریں، آؤ دین پھیلائیں کے پیغام کو اپنالیں اور اس پیغام پر انفرادی اور اجتماعی طور پر عمل کریں تو اس کا لازمی فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا دینی ذہن بنے گا، مل کر کام کرنے کی لگن پیدا ہوگی، دینی شعور بڑھے گا تو اس کے اثرات دور دور تک جائیں گے، اس کی روشنی زندگی کے دوسرے گوشوں پر پڑے گی، پھر زندگی کے دوسرے گوشے دین کے زیر اثر آئیں گے اور لوگ اپنے تئیں کوشش کرنے لگیں گے کہ ممکن حد تک دین کے مطابق زندگی گزاریں اور رضائے الٰہی کے لیے کام کریں، ملت اور افراد ملت کی ہمدردی میں ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار رہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہو۔

بروقت صورتِ حال یہ ہے کہ اہل حدیث عوام اور خواص سب بلا ہدف اور بے راہ منزل زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، جتنا کچھ اور جو کچھ دعوتی اجتماعی اور عملی کام ہو رہا ہے وہ انتشار اور عدم رہنمائی یا غلط رہنمائی کا شکار ہے اور ان سے یہ طے ہو ہی نہیں پاتا ہے کہ راستہ کدھر ہے؟ منزل کہاں ہے؟ روشنی ہے نہیں، مشعل راہ کا پتہ نہیں۔ دین کا اجالا اور مشعل راہ آسانی سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے بڑی جدو جہد کرنی پڑتی ہے اس کی ابتداء تربیت وتزکیہ ہے اور اس کی جگہ مسجد سے جڑنا جوڑنا اور دین سیکھنا سکھانا اور اس پر عمل کرنا ہے اور اسے پھیلانا ہے۔ مسلمانوں کے اجتماعی عمل کا ان کی ذہن سازی کا، کردار سازی کا یہی کامیاب اور مجرب راستہ ہے۔

اگر اجتماعی عمل اور تربیت کی اس راہ کو چھوڑ دیا جائے اور لوگوں کی سیاست کا ڈرگ پلایا جائے یا تقریر سننے اور جلسہ کرنے کا نشہ سنگھا دیا جائے تو اس سے بے راہ روی، انتشار اور غفلت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمارے یہاں زمانے سے مساجد سے جوڑنے، اجتماعی ذہن بنانے صالحیت پیدا کرنے تربیت کرنے اور عملی انسان بنانے کے بجائے عوام وخواص سے رابطہ توڑ لیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کا تعلق تقریر سننے سے ہے ان کا کام ہے تقریریں سننا اور مقررین کا کام ہے تقریریں سنانا۔ بس یہی کل تعلق ہے عوام وخواص کا دین کے اجتماعی جدو جہد اور تربیت سے۔ یہ اتنا بڑا خلا ہے کہ پورا میدان اجتماعی تربیتی اور دعوتی عمل سے خالی ہوگیا ہے اور ہمارے

اپنے خواص وعوام سب خالی ذہن اور خالی قلب ہوگئے نہ دین کے لیے فکر، نہ جوش، نہ ولولہ، نہ لگن، نہ محنت، بلکہ عموماً غیر معیاری، مخرب دین واخلاق تقریروں سے ہر طرف فساد ہی فساد پھیل گیا ہے۔ اسی بے عملی یا بدعملی کی المناک صورتِ حال ہے کہ آج افراد جماعت کے اندر ہر طرف سناٹا ہے انتشار ہے بے راہ روی ہے۔

اسلام کا مزاج اجتماعیت کا ہے۔ اجتماعی عمل سے جڑنے کے لیے ہدف پیغام عمل راہ نمائی، تربیت اور محنت ضروری ہے۔ ان کے بغیر اجتماعی عمل سے افراد نہیں جڑ سکتے اور اگر جڑیں بھی تو ہدف عمل، تربیت رہنمائی اور محنت کے بغیر ان کا جڑنا اور بکھرنا ہم معنی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ان تمام تربیتی دعوتی اور اجتماعی عمل کا فقدان ہے اس لیے نہ اجتماعیت ہے نہ اجتماعی عمل ہے۔ اجتماعی دعوت اور تربیتی عمل سے جڑنے کا قضیہ، بس بکھرو ہی بکھراؤ ہے۔ تربیتی دعوتی اور اجتماعی عمل سے جڑنے کی ہمارے سامنے دو مثالیں اور تجربے ہیں۔

ایک تجربہ جماعت اسلامی کا ہے۔ اس جماعت میں اجتماعی عمل کی اساس سیاست ہے۔ اس کے لیے انھوں نے میڈیا کا سہارا لیا۔ ان کے ساتھ لوگ قلیل تعداد میں جڑے، اجتماعی عمل جاری ہوا۔ لیکن سیاسی چسکہ ان کی تباہی کا سامان بن گیا وہ سکڑ کر اور بے راہ ومنزل ہو کر رہ گئے۔ لیکن ان کا غیر محتاط اور غیر مہتداہ اجتماعی عمل بے عملی سے بہتر ثابت ہوا۔ ان سے ملت کے فلاح و بہبود کا کوئی نہ کوئی کام تو ہوا۔ ہمارے ہاں کی ویرانی تو ان کے اندر نہیں رہی۔

دوسرا تجربہ تبلیغی جماعت کا ہے، انھوں نے لوگوں کو مساجد سے جوڑا، ہدف اور عمل دیا، محنت کی، دعوتی تربیتی اور اجتماعی عمل سے جوڑا اور عالمگیر دعوت کا مشن کھڑا کر دیا۔ بھرپور، منظم۔ چھ باتوں نے ہی انھیں ایسا فکر مند اور لگن والا بنا دیا کہ ان کے لیے ہر کام آسان ہو گیا وہ تعلیمی تجارتی رفاہی کوئی بھی کام کرنا چاہیں بڑے پیمانے پر بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔ اور ساری دنیا میں یکسانیت کے ساتھ اور بے مقصد دیگر الجھاؤ اور الجھنوں سے بچ کر۔ مثلاً وہ سیاست نہ کر کے ملکوں کے صدر، وزیر اعظم وزیر بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور سماج کے ہر طبقے پر ان کی پکڑ رہتی ہے۔ بات ان کے سسٹم کی ہو رہی ہے جس کو سب محسوس کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان کا عقیدہ وعمل کیسا ہے؟

ان دونوں تجربوں کے مقابلے میں ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم بس صحرا کو سینچتے ہیں اور گولر کا پھول توڑنے میں لگے رہتے ہیں کسی بھی شناخت رکھنے والی جماعت یا گروہ کی بقا اور ترقی کے لیے قیادت، مرکز، محنت اور منہج کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے پاس نہ مرکزیت ہے نہ قیادت ہے نہ محنت۔ منہج ہے لیکن اکثریت نہ اس کا استعمال کرتی ہے، نہ اسے اس کا علم ہے۔ اگر یہ چاروں عناصر کسی شناخت والے گروہ کے اندر موجود ہوں تو اسے کامیابی ضرور ملتی ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ منہج، عمل تربیت، پیغام اور اجتماعیت کو طے کرتا ہے انھیں صحیح رخ دیتا ہے۔ منصوبہ بناتا ہے اہلیت وصالحیت نکھارتا ہے راہ دکھلاتا اور منزل طے کرتا ہے اور نتائج کی تبشیر کرتا ہے۔ محنت سے یہ سارے کام انجام پاتے ہیں۔ قیادت کام کو صحیح رخ پر لے چلتی ہے اور منزل تک پہونچا دیتی ہے اور مرکز عمل میں ترکیز اور اجتماعیت پیدا کرتا ہے اور سارے اجتماعی منہجی طریقے سے تربیت کا کام انجام پاتا ہے۔

ملک میں اہل حدیث زیرو پوائنٹ پر ٹھہرے ہوئے ہیں بلکہ بے عملی اور بدعملی کی بناء پر مائنس میں چل رہے ہیں۔ اس کا احساس اکثر نیک دل اور حساس لوگوں کو ہے لیکن کریں بھی تو کیا؟ مقامی سے لے کر قومی سطح تک ایسی الجھنیں اور سلبیات جمع ہوگئی ہیں کہ گندگی کا ایک ملبہ ہے جسے ہٹانا ضروری ہے۔ سلبیات کا ملبہ ہٹنے سے رہا۔ شرافت اور عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اس ملبے سے بچ کر کنارا کاٹ کر عملی راہ تلاش کی جائے اور کام لگن اور محنت سے شروع ہو۔

ویرانوں کو آباد کرنا آسان کام نہیں ہوتا۔ ویرانوں کو آباد کرنے کے لیے خون پسینہ گرانا پڑتا ہے لگاتار محنت کرنی پڑتی ہے پودے لگانے پڑے ہیں، سینچنا پڑتا ہے، رات دن نگرانی کرنی پڑتی ہے۔ چن چن کر اچھے پودوں کی کاشت کرنی پڑتی ہے تب ویرانہ آباد ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ طے کر کے ویرانے میں قدم رکھے اور جھٹ وہاں پیروں میں پھول نچھاور کیے جائیں گے۔ شیریں پھلوں سے ضیافت ہوگی، یافت ہوگی، شادمانی وکامرانی ملے گی تو یہ امرِ محال ہے۔ ویرانے کی فطرت اور قانون ہے کہ پہلے پہل گرد وغبار جھاڑ وجھنکاڑ کے سوا وہاں کچھ نہیں ملتا۔ وہ طلب جستجو محنت، مسلسل دیکھ ریکھ تیقظ اور بیداری کا نذرانہ مانگتا ہے تب جا کر پھل پھول شادکامی اور کامرانی دیتا ہے۔

یہی حال اس وقت ہماری جماعت کے ویرانے کا حال ہے، پہلے پہل یہاں سے یافت شادمانی اور کامرانی کی توقع عبث ہے اگر ہم اسے محنت طلب دیکھ ریکھ تیقظ اور بیداری کا نذرانہ اور قربانی دیں تب اس کے شیریں پھل ہمیں مل سکتے ہیں۔

۳۱ر جولائی کی میٹنگ میں عملی قدم اٹھانے راہ ومنزل طے کرنے اور جادہ پیما ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عملی اقدام جیسا کہ تفصیل گزری اس لیے کیا جا رہا ہے کہ مساجد سے لوگوں کو جوڑا جائے وہیں سیرت سازی ہو، اجتماعیت کا مزاج بنے، دعوتی عمل شروع ہو اور اس کی بنیاد پر جماعت ہر مطلوب کام کرے۔

☆☆☆

# مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

## مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔ ۱۹۲۵ء-۲۰۱۵ء

صلاح الدین مقبول احمد

''فقہائے ہند'' اور ''برِصغیر میں اہل حدیث کی اولیات'' جیسی درجنوں کتابوں کے فاضل مصنف ،برِصغیر کے مشہور زمانہ مورّخ ،نامور صحافی اور عظیم سوانح نگار: علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ (بطور خاص تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح کے میدان میں اپنے کارہائے نمایاں کے سبب) کسی تعارف کے محتاج نہیں:

آنکہ کردہ ست طرزِ نو ایجاد　　مردِ تاریخ و سیرت آں آزاد
مانہ دیدیم کس را ہم سرِ او　　شد بہ او یاد رفتگاں آباد
چوں ایں گوئیم چناں دیگر نیست
''چشم ما روشن و دلِ ماشاد''

وسعت معلومات،قوت حافظہ ،استحضار واقعات و حادثات، پھر لطافت و ظرافت کی آمیزش کے ساتھ مشاہدات کی تصویر کشی میں اسلوب نگارش کے سحر حلال کی تاثیر، قارئین کے دل ودماغ پر قبضہ جما کر انھیں ہنساتی اور رلاتی رہتی ہے۔

جولانیِ طبع اور سیلانیِ قلم کے ساتھ ان کی سادگی و بے نفسی اور اپنے مشن سے والہانہ وابستگی نے ان کے کام اور وقت میں برکت ڈال دی ہے، ورنہ موضوع سے متعلق خود مصادر ومراجع تلاش کرنا ،مکتبات اور لائبریریوں کی خاک چھاننا، اپنی کتاب کی کمپوزنگ کے بعد خود ہی پروف ریڈنگ کرنا، پھر پریس تک اس کا پیچھا کرنا اور وہاں کے ناز ونخرے برداشت کرنا:

ع　　اتنے سامانِ ستم اور ایک جان عندلیب

مزید برآں پیرانہ سالی اور اس کے عوارض، پھر بھی پائے استقلال میں لرزش نہ آئے یہ اللہ رب العزت کی توفیق وتائید کے بغیر ناممکن ہے: ذلك فضل الله يؤ تيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم[سورة الجمعة:۴]

ایں سعادت بزورِ بازو نیست　　تانہ بخشد خدائے بخشندہ

میں فاضل گرامی مولانا بھٹی (رحمہ اللہ) کے بارے میں یہ باتیں محض خوش اعتقادی کی بنیاد پر نہیں (کہ بے جا مدح وذم کی ہمارے مسلک میں کوئی گنجائش نہیں) بلکہ یہ حقیقت ہے۔ ع　　ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

صرف کتاب ''مولانا اسحاق بھٹی: حیات وخدمات'' (مرتبہ مولانا محمد رمضان سلفی) کا مطالعہ فرما لیا جائے جس میں مختلف مکاتب فکر اور میدانہائے عمل سے وابستہ تقریباً (۲۵) مقالہ نگاروں نے ان کی زندگی میں جس فراخ دلی سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کی مثال اس پرآشوب دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، ورنہ یہ مردہ پرست قوم مرنے کے بعد ہی اپنے محسنین کے بارے میں (اگر سوچا بھی تو) سوچنے کی عادی ہے۔

مذکورہ بالا مجموعے میں بھٹی صاحب پر میرے عربی مضمون (مطبوعہ ''امتی'' کویت جولائی ۲۰۰۸ء) کا ترجمہ بھی شاملِ اشاعت ہے۔

جناب بھٹی صاحب نے تاریخ وتذکرے اور سیرت وسوانح میں اپنے معروف اور دس جلدوں میں مطبوع کتاب ''فقہائے پاک وہند'' سے لے کر آج تک کی تصانیف کے کئی ہزار صفحات میں مستقلاً اور ضمناً ہزاروں مرحومین اور موجودین کے محاسن کو اجاگر کر کے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ میری نظر میں (الجزاء من جنس العمل) کی روشنی میں بھٹی صاحب کے ساتھ ان کے مقالہ نگاروں کا یہ فیاضانہ برتاؤ اسی کارِ خیر کا نتیجہ اور بدلہ ہے۔

اور پھر یہ اعتراف شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کی دلیل بھی ہے، صحیح حدیث میں وارد مضمون کا آزاد ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو　　زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

**شخصیت کی تشکیل:** بھٹی صاحب کی شخصیت کی تشکیل میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی ،مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد اسماعیل سلفی کی تربیت دسر پرستی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد حنیف ندوی وغیرہ سے نیازمندانہ تعلقِ خاطر وغیرہ عناصر کا بنیادی کردار ہے۔

آزادیٔ برِصغیر سے قبل اپنے سیاسی رفیق گیانی ذیل سنگھ (سابق صدر جمہوریۂ ہند) اور علاقہ کے دیگر رفقاء کے ساتھ انقلابی سفر کا آغاز ہوا، اور معاملہ جیل کی ہوا خوری تک بھی پہنچا۔

جمعیۃ اہل حدیث، اور ''ادارۂ ثقافت اسلامیہ'' (لاہور) سے وابستگی نے برصغیر کے سربرآوردہ علماء وزعماء اور ادباء وشعراء سے ملاقات وتعلقات کا راستہ ہموار کیا اور مختلف مکاتب فکر اور میدانہائے عمل کے ماہرین سے استفادہ کا موقع ملا، لیکن اپنی تحریر میں کسی کی پیروی نہ کر کے خود ایک صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز بن کر ابھرے۔ ع　　ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

**تحریر کی خصوصیات:**

● بھٹی صاحب کی تحریروں میں نفرت کا عنصر ناپید اور محبت والفت کی فراوانی ہے ''مرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے''۔ محترمہ فوزیہ سحر ملک (شعبۂ اردو،

گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین۔ فیصل آباد) اپنے (ایم فل) کے تحقیقی مقالہ ''مولانا اسحٰق بھٹی کی خاکہ نگاری: فنی اور تنقیدی جائزہ'' میں تنقید کے موقع پر بھی بھٹی صاحب کے سحر حلال سے مسحور ہو کر فرماتی ہیں کہ وہ مسلکاً اہل حدیث ہیں لیکن دوسروں کے بارے میں ان کے یہاں تعصب نہیں۔

بھٹی صاحب کے کسی بے تکلف اور ظریف دوست نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ''طریقۂ محمدیہ'' قائم کر کے لوگوں سے اس پر بیعت لیں، تو بھٹی صاحب نے بھی اسی انداز میں فرمایا کہ اصلاح کا کام اپنے گھر سے شروع ہوتا ہے، لیکن گھر میں سب کو معلوم ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں؟

● اپنے عقیدہ و منہج کی پاسبانی اور اس سلسلے میں اپنے اطمینان کا اظہار اور معاشرتی اقدار و روایات کی پاسداری اور ان کی پامالی پر مصلحانہ تبصرے جابجا ان کی تحریروں کی زینت ہیں۔

''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کے فریضے کی ادائیگی ایک انصاف پسند محرر پر واجب ہے، بھٹی صاحب نے یہ فریضہ جریدۂ ''الاعتصام'' (لاہور) کی ادارت کے زمانے میں بخوبی انجام دیا ہے۔ اعتقادی، معاشرتی تحریکی اور سیاسی مسائل پر بڑی قابلیت کے ساتھ جرأتمندانہ اظہارِ خیال فرمایا ہے، اپنے علم کے مطابق ایک مسئلہ (اور اس کے لوازمات) کے علاوہ انھیں کہیں سپر ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا، کشف قبور و صدور کے متعلق اپنے ایک ''شذرہ'' کے بارے میں اپنے سرپرست مولانا محمد داؤد غزنوی کی اس توجیہ پر صاد فرمادیا کہ اگر فلاں کو کشف ہوتا ہے تو آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟۔ حالانکہ انکے شذرے کا موقف بالکل صحیح تھا اور آج بھی ہے اور رہے گا، کیونکہ اعتقادی امور میں تغیر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ورنہ کشف قبور و صدور کے دعویٰ کے سامنے عقیدۂ ایمان بالغیب ہی متاثر ہو کر رہ جائے گا، جس کی توضیح و تائید کے لئے ہمارے اسلاف نے برِّصغیر میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کی ہیں، جن پر ہم آج جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے!

اپنے عقیدہ و مسلک کی حقانیت اور اس کی برملا وضاحت کے بارے میں فاضل گرامی بھٹی صاحب کا سرور انگیز بیان ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے اپنی تحریروں اور ریڈیائی اور ٹیلی ویژنی پروگراموں میں ہمیشہ اپنے مسلک کو ملحوظ خاطر رکھا، اور اس کی خدمت کی، بحمد اللہ ایک لمحے کے لئے بھی اس میں لچک نہیں آنے دی۔ الحمد للہ اس فقیر نے ہر جگہ دھڑلے سے اپنے مسلک کی حقانیت کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ گفتگو اور تحریر میں کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوا'' (گزر گئی گزران: ص ۲۶۳)

● فاضل گرامی بھٹی صاحب نے اپنے جماعتی اور صحافتی فریضے کی ادائیگی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی، ۱۹۵۴ء میں جب دارالعلوم دیوبند سے بائیس طالب علموں کا اس بنا پر اخراج کر دیا گیا کہ وہ اہل حدیث مسلک کے حامل تھے، اس حادثہ کے تذکرے میں رقم طراز ہیں:

''میں اس وقت اخبار ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر تھا، جو جماعت اہل حدیث کا ترجمان تھا، میرا جماعتی اور صحافتی فرض تھا کہ اس موقع پر اپنی جماعت کے جذبات کی ترجمانی کرتا اور اس خبر سے اہل حدیث حضرات کے قلوب و اذہان میں جن تاثرات و عواطف نے کروٹ لی تھی اس کی وضاحت کرتا چنانچہ میں نے (۱۹/ فروری ۱۹۵۴ء کے ''الاعتصام'' میں ''دارالعلوم دیو بند سے اہل حدیث طلبہ کا اخراج'' کے عنوان سے لکھا''۔

اس کے چند روز بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دارالعلوم۔ دیوبند) کا اہل حدیث طلبہ کے اخراج کے بارے میں وضاحتی بیان آیا، وہ ''بیان ان کے مقام و منزلت سے ہم آہنگ نہ تھا''، ادب و تکریم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے بیان کا (۲۶/ مارچ ۱۹۵۴ء) کے ''الاعتصام'' میں تجزیہ کیا۔

مولانا رئیس احمد جعفری ندوی نے دونوں اداریے اپنے ''ریاض'' میں شائع کیے، اور موضوع سے متعلق خود بھی بعنوان (دیوبند کس طرف؟ ایں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست) اداریہ لکھا، جس کا ایک ایک لفظ قابل مطالعہ ہے، رقم طراز ہیں:

''ہمیں یاد ہے کچھ عرصہ ہوا مولانا ابوالکلام آزاد دیوبند تشریف لے گئے تھے، ان کا وہاں شاہانہ استقبال طلبہ اور اساتذہ نے یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کیا تھا کہ وہ اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، اور مولانا اس استقبال کی بڑی خوش گوار یاد لے کر وہاں سے تشریف لائے تھے۔

''یہ کیسی عجیب بات ہے، کہ اہل حدیث اگر وزیر تعلیم ہو تو دیدہ و دل فرش راہ کیے جاتے ہیں، اور اگر طالب علم ہو تو بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا جاتا ہے۔ ع

''یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟'' (بزم ارجمنداں: ۴۲۲-۴۲۵)

● معاشرتی اقدار و روایات (ایفائے عہد، عدل و انصاف، پردہ نشینی اور عصمت و حشمت وغیرہ) کی پامالی پر اپنی تحریروں میں مصلحانہ تبصرے فرماتے ہیں۔ اسی طرح زعمائے سیاست کی بازیگری اور سیاسی پارٹیوں کی ملک و ملت کے بارے میں بے توجہی کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

کوئی بھی دردمند صحافی اپنے ماحول و معاشرے، ملّی مسائل اور مسلکی سیاست سے کسی بھی حال میں کبھی بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا:

کرتا رہوں گا جبر و تشدد پہ احتجاج — جب تک زباں میں طاقت عرض کلام ہے
لگتا رہے گا زخم جبینِ جمود پر — جب تک مرے قلم کی انی بے نیام ہے

ان اشعار میں بھٹی صاحب جیسے صحافیوں کی ترجمانی ہے۔

● فاضل گرامی بھٹی صاحب کے متعارفین کے نزدیک ان کی قدردانی علم و

علماء، ظرافت و بذلہ سنجی، تواضع اور خاکساری، ضیافت وقناعت اور صبر وتوکل وغیرہ اوصاف جمیلہ متفق علیہ ہیں۔

اگر علامہ اقبال مرحوم آج زندہ ہوتے تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرتا کہ اپنے کلیات کے صرف یہ دو اشعار ہمارے بزرگ بھٹی صاحب کی نظر کر دیں کیونکہ میری نظر میں یہ اشعار آج ان سے زیادہ کسی اور پر منطبق نظر نہیں آتے، ملاحظہ فرمائیں:

گذر اوقات کر لیتا ہے وہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی

اور:

مری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معنی کی کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

● اللہ تعالیٰ نے اس دور میں بھٹی صاحب کو تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح اور صحافت وادارت کے لئے منتخب کر لیا تھا، لیکن وہ ابتداء میں کچھ دنوں منزل کی تلاش میں بھٹکتے بھی رہے، ڈرائیوری کے لئے اسٹیرنگ بھی سنبھالی، دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اپنے لوگوں کے ساتھ وادیٔ چنبل سے ٹرک پر ریت لاکر آگرہ ایرپورٹ کی تعمیر میں حصہ بھی لیا، گندم کی تجارت شروع کی، کھیت میں کام کیا، بیلنے سے گڑ بنائے اور لاہور اور راولپنڈی میں بھوسے کی مارکیٹ بنانے میں ناکام ہوئے۔

اپنی منزل سے بہت دور ان وادیوں میں بھٹکنے کے بعد نئی راہوں کا سراغ ملا اور خود منزل مقصود سامنے آگئی۔ اور پھر:

ع آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی

''جمعیت اہل حدیث'' اور اس کے ترجمان ''الاعتصام'' سے وابستگی، ''ادارۂ ثقافت اسلامیہ'' اور اس کے آرگن ''المعارف'' میں قلمی خدمات کا سلسلہ شروع ہوا، برِصغیر کے ان دونوں معروف جرائد کی ادارت کا شرف مختلف اوقات میں شاید بھٹی صاحب کے علاوہ صرف مولانا محمد حنیف ندوی کو ہی حاصل ہوا ہے اور دونوں اہل حدیث تھے۔

اور اسی طرح اہل حدیثوں میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کے لیے سب سے پہلے مولانا ندوی اور پھر بھٹی صاحب کو ہی یاد کیا گیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب ریڈیو پر تقریر کیا لوگوں کے گھروں میں ریڈیو ہی نہ ہوتا تھا، خود بھٹی صاحب کے گھر میں ریڈیو نہ تھا۔

قابل ذکر ہے مولانا بھٹی صاحب نے ریڈیو والوں سے کہہ کر ''زندہ تابندہ'' پروگرام میں (۴۵) علمائے اہل حدیث برِصغیر پر تقریریں کیں، پہلی دفعہ اتنی تعداد میں اہل حدیث کا تذکرہ ریڈیو پر ہوا، بالعموم دیوبندی، بریلوی اور شیعہ حضرات کے تذکرے تو ہوتے ہی رہتے تھے۔

## قلم وقرطاس سے وابستگی اور میدانہائے تگ وتاز:

❁ فاضل گرامی بھٹی صاحب کا قلم وقرطاس سے رشتہ تقریباً ۱۹۴۹ء یا اس سے قبل قائم ہوا تھا، جس پر کم از کم (۶۷) سڑسٹھ سال کا عرصہ گزر رہا ہے، اس رشتے کی پختگی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ہائی کورٹ کے اپنے جج دوست کی طرف سے ہموار کردہ وظیفۂ مشیر عدالت اور نظریاتی کونسل کی رکنیت وغیرہ محض اس لئے قبول نہ کی کہ کہیں اس رشتے میں دراڑ نہ آجائے۔ اب اس رشتے کے بعد کسی دوسرے رشتے کی کوئی ضرورت نہیں، گویا فرما رہے ہوں:

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

قلم وقرطاس سے والہانہ وابستگی کا ہی نتیجہ ہے کہ مختلف موضوعات پر بہت لکھا اور خوب لکھا، بطور خاص تاریخ وتذکرے اور سیرت وسوانح کے باب میں برِصغیر کے اندر ان کا کوئی ہم پایہ نہیں۔

مولانا بھٹی صاحب جذبۂ شکر گذاری کے طور پر خود رقم طراز ہیں:

''میری اب تک کی تحریریں حسب ذیل نوعیت کی ہیں:

(۱) تصانیف و تراجم۔ (۲) اخباری مقالات و مضامین۔ (۳) اخباری اداریے اور شذرات۔ (۴) بے شمار کتابوں پر تبصرے۔ (۵) بہت سی کتابوں پر مقدمے۔ (۶) ریڈیائی تقریریں۔

حساب کیا جائے تو یہ خدمات جو چھ اقسام پر منقسم ہیں، تقریباً پچاس ہزار صفحات تک پہونچ جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے جو اس نے اس فقیر پر فرمایا۔'' (گزر گئی گزران: ۲۶۳)

تربیت ہر ایک کی کرتی نہیں فطرت مگر
کم ہیں وہ طائر جو ہوں قید قفس سے ارجمند

## ظرافت:

❁ ظرافت وبذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی وخوش طبعی ان کی فطرت ثانیہ ہے، لطیفے کا انکے بغیر اور ان کا لطیفے کے بغیر گذارا ہی نہیں، اس سے نہ ان کی کوئی تحریر خالی ہوتی ہے اور نہ تقریر، مجلس مین سوز وساز دونوں کیفیتوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کے اس وصف کو راقم نے یوں بیان کیا ہے:

ذکرِ ''اسلاف'' سے معمور، ادھر ''زندہ دلی''
ان کی مجلس سے ہمیں سوز ملا، ساز ملا

خود اندازِ بیان نہایت پر لطف پھر دوسروں کے لطیفوں سے بھی تقویت حاصل کرتے ہیں، زندہ دلی کا یہ عالم ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو، یا کوئی دوسرا بھی انہیں ہدف بنالے تو اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کا خود ارشاد ہے کہ: ''زندگی اسی کا نام

تو نہیں کہ آپ ہر وقت ماتھے پر تیوریاں چڑھائے رکھیں اور کسی سے ہنسی مذاق کی کوئی بات نہ کریں، طنز و مزاح زندگی کے لازمی اجزاء ہیں انھیں ہرگز دوائر حیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا" (ہفت اقلیم: ۸۸)

● بسا اوقات ظرافت نما صحت مند تنقید سے اصلاح حال کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اور ظریفانہ انداز بیان سے عبرت و نصیحت کا پہلو بھی واضح ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

معذرت کے بعد، مولانا رئیس احمد جعفری ندوی کا مقولہ (دارالعلوم دیوبند سے اہل حدیث طلبہ کے اخراج کے بارے میں) مکرر عرض ہے:

"یہ کیسی عجیب بات ہے، اہل حدیث اگر وزیر تعلیم ہو تو دیدہ و دل فرش راہ کیے جاتے ہیں، اور اگر طالب علم ہو تو بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا جاتا ہے۔ ع

یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں" (بزم ارجمنداں: ۴۲۵)

● جماعت اسلامی کے اجلاس پٹنہ میں گاندھی جی مدعو کیے گئے اور ڈاکٹر امبیڈکر جو سات کروڑ اچھوتوں کے ساتھ مسلمان ہو جانے کا اعلان کیا کرتے تھے ان کو مدعو نہیں کیا گیا اس پر بھٹی صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہے:

"ڈاکٹر امبیڈکر کو پٹنہ کے اجتماع میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی، صرف گاندھی جی وہ خوش قسمت تھے جنھیں دعوت اجتماع سے نوازا گیا تھا۔ کیا مختلف تھا کہ اگر مختلف جماعتوں کے علمائے کرام اور ڈاکٹر امبیڈکر کو "مؤلفۃ القلوب" کے کوٹے سے ہی دعوت کا مستحق سمجھ لیا جاتا" (ہفت اقلیم: ص ۴۷)

● مخلوط تعلیم اور مخلوط اسمبلی میں کیا فرق ہے؟ جماعت اسلامی کے اس موقف پر نقد ملاحظہ فرمائیں:

"سوال یہ ہے کہ اگر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کا اکٹھے تعلیم حاصل کرنا شریعت کے خلاف ہے تو کیا اسمبلیوں اور سینٹ میں ان کا مردوں کے ساتھ بیٹھنا اور مختلف قسم کی باتیں کرنا اور سننا جائز ہے؟ بڑے لوگ اگرچہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، جن میں بہت بڑی خصوصیت وعدہ خلافی اور تضاد بیانی ہے" (ہفت اقلیم: ۸۷-۸۸)

● ۵، ۶ رمئی ۱۹۶۰ء کو ایوب خاں نے "آئین کمیشن" کے تیار کردہ چالیس سوالات کا جواب دینے کے لئے ایک اجلاس منعقد کیا، جس میں واقعی تمام جماعتوں کے رہنما، معروف جرائد و مجلات کے مدیران، مشہور مساجد کے خطباء اور دیگر علماء موجود تھے، بھٹی صاحب رقم طراز ہیں:

"اجلاس کی جو کاروائی ضبط تحریر میں لائی گئی تھی اس کے آغاز میں اسے "سربر آوردہ علماء اور اہل فکر کی مجلس" قرار دیا گیا تھا، بہ الفاظ دیگر اس میں دو قسم کے حضرات شریک ہوئے تھے ایک "سربرآوردہ علماء" اور دوسرے "اہل فکر"..... ان انیس شرکاء میں سربرآوردہ علماء کی تعداد سترہ تھی اور اس حساب سے ان کی نمائندگی ماشاء اللہ بڑی معقول تھی، لیکن اہل فکر صرف دو تھے، ایک میں اور ایک میاں طفیل محمد.....!

مجھے اپنے آٹے دانے کی فکر رہتی تھی اور میاں صاحب کو اپنے ادارے کی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کی۔۔۔۔۔!! (ہفت اقلیم: ۹۸-۱۰۴)

● ۱۹۶۲ء کے انتخاب میں جماعت اسلامی نے بھی حصہ لیا، اس پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

"غور فرمایئے! ۱۹۴۶ء کے انتخاب میں حصہ لینا اور کسی کو ووٹ دینا جماعت اسلامی کے نزدیک ممنوع تھا، اور ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں اسمبلی کا انتخاب لڑنا جائز تھا لیکن کسی سے ووٹ مانگنا شرعاً ناجائز تھا، اب جائز بالکل ضروری قرار پایا۔

یعنی نظریۂ ضرورت کے تحت جماعت اسلامی کے مسائل بدلتے رہے اور بدل رہے ہیں، ہمارے ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے شاید نظریۂ ضرورت جماعت اسلامی ہی سے لیا ہے" (ہفت اقلیم: ۱۰۴)

● مرزا غلام احمد قادیانی (م-۱۹۰۸ء) اپنے مخالفین کے حق میں ہمیشہ بددعا کرتے تھے لیکن وہ پوری نہ ہوتی تھی، اپریل ۱۹۰۷ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی گرفت سے تنگ آکر پیش گوئی کرتے ہوئے دعا کی کہ "ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مرجائے"۔

بھٹی صاحب فرماتے ہیں:

"اسے مرزا غلام احمد قادیانی کی پیش گوئی کہئے یا دعا اور بددعا سے تعبیر کیجئے، یہ ان کی "اکلوتی" پیش گوئی یا دعا تھی جو حرف بحرف پوری ہوئی، اور اس کے گیارہ مہینے بعد ۲۹ رمئی ۱۹۰۸ء کو مرزا صاحب کی لاہور میں موت واقع ہوگئی، اور مولانا امرتسری نے مرزا کے چالیس سال بعد (۱۵ رمارچ ۱۹۴۸ء) میں وفات پائی" (اولیات: ۸۲)

● مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہو کر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، مولانا بھٹی صاحب فرماتے ہیں، کہ مولانا محمد حنیف ندوی نے ملاقات کے وقت سید صاحب سے کہا کہ:

"آپ نے "سیرۃ النبی" کو "بہشتی زیور" کے قدموں پر ڈال دیا"۔

● ۱۹۶۲ء کے انتخاب میں جناب نعیم صدیقی صاحب جماعت اسلامی کے امیدواروں میں تھے وہ مولانا محمد داؤد غزنوی کے پاس اس سلسلے میں مدد کے لیے آئے، مولانا غزنوی نے بھٹی صاحب کو ان کے ساتھ جا کر ووٹ مانگنے کے لیے کہا، نعیم صدیقی صاحب حقے اور سگریٹ کے عادی تھے لیکن مولانا غزنوی کے پاس کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے رہے اور احترام میں سگریٹ نہیں پیا بھٹی صاحب فرماتے ہیں:

"ہم ان کے کمرے سے باہر نکلے اور سڑک پر آئے تو انھوں نے جلدی سے کیپٹن سگریٹ نکال کر سلگایا، پہلے دو کش حقے کی نے کی طرح سگریٹ موٹھ میں رکھ

کر لیے، پھر اسے چھنگلیا اور اس کے ساتھ کی انگلی کے درمیان میں رکھا اور دو تین لمبے لمبے کش لے کر اس کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔

ہم نے اللہ کا نام لے کر اور نعیم صدیقی صاحب نے سگریٹ پی کر اسی وقت انتخابی سرگرمیوں کا آغاز کیا'' (ہفت اقلیم: ۱۰۴-۱۰۵)

● پروفیسر فوزیہ سحر ملک (شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج برائے خواتین، فیصل آباد) بھٹی صاحب پر اپنے ایم فل کے مقالے میں رقم طراز ہیں:

''مولانا محمد اسحاق بھٹی نہ صرف جماعت اہل حدیث کے قابل فخر اور نامور صاحب قلم ہیں بلکہ وہ پاکستان کے بہترین شگفتہ نگار اور صاحب طرز انشاء پردازوں میں سے ایک ہیں، شخصیات پر ان کے قلم کی شگفتہ نگاری اور تحریروں کی دلربائی کا کوئی جواب نہیں''۔

''مولانا بڑے ہنس مکھ، ملنسار، مہمان نواز، بذلہ سنج، لطیفے سننے اور سنانے کے شوقین ہیں، کہتے ہیں میرا اس کے بغیر گذارہ نہیں، جب تک خود لطیفے کی زد میں نہ آؤں اور دوسروں کو زد میں لانے کی کوشش نہ کروں ذہنی اطمینان نہیں ہوتا۔'' (محمد اسحاق بھٹی کی خاکہ نگاری: ۳۰-۳۴)

**منظوم اوصاف جمیلہ:**

مولانا بھٹی رحمہ اللہ کے دیرینہ ''آزاد خیال'' رفیق مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری ندوی (۱۹۰۲-۱۹۸۲ء) نے تفاوت سن وسال کے باوجود اپنے مقفع و مسجع نظم نما نثر (خط) میں ان کی شخصیت اور اوصاف جمیلہ کا ایک جامع خاکہ پیش کیا ہے، جسے اس راقم سطور نے مکمل نظم کا جامہ پہنا دیا ہے۔

ردیف اور دوسرے مصرعے کے بیشتر الفاظ اسی خط سے ماخوذ ہیں اور ہر پہلے مصرعے میں شاعر کی تمہید یا دوسرے مصرعے کی تشریح و وضاحت ہے، ملاحظہ فرمائیں:

خط سے معلوم ہوا، یہ ہیں محمد اسحاق — ہیں رفاقت میں وہ مخلص، نہ تلوّن، نہ نفاق
طمطراقی نہیں ان میں کوئی لیڈر جیسی — ذوق میں وہ ہیں وہابی تو ہے فطرت میں مذاق
اپنے فن سے انھیں وابستگی و دل بندی — اپنے میدان کے فنکار، وہ ماہر، مشّاق
ذمہ داری کا ہے احساسِ فراواں ہر دم — چاق و چوبند ہیں، چوکس بھی، عمل میں سبّاق
ان کو ہے اپنے فرائض سے تعلق ایسا — اس میں انفس بھی وہی، اور وہی ہیں آفاق
سادگی اور صراحت ہیں خصائص ان کے — طمطراقی نہ تکلف، نہ کلامِ لبّاق
خوبیِ طبع کہ پابندِ مواعید ہیں وہ — ان سے وابستہ ہے پابندیِ عہد و میثاق
مسلکاً وہ ہیں وہابی نہیں اس میں شبہہ — خود مزاجاً ہیں وہ درویشِ قرینِ انفاق
ان کو حاصل ہے قناعت کا مقامِ عالی — حرص دولت ہی نہیں، پھر کیا سوالِ املاق
ہے تعلق میں صداقت کا، نزاہت کا خیال — رکھتے ہر اک سے ہیں وہ اپنا حساب بیباق

ان کے انداز میں موجود شفائے کامل — وہ تو خود زہرِ ہلاہل کے لیے ہیں تریاق
ان کا اک قاضیِ حاجات، تو پھر غم کیسا؟ — ربِّ رحمان ہے، منّان و رحیم و خلّاق
ہے توکل کسی بندے پہ خلافِ فطرت — دوسرے کیا ہیں جو موجود ہو اپنا رزّاق
نیک طینت کے لیے وہ ہیں سراپا شفقت — بدکا کردار تو بس ان کے لیے ہے اک شاق
قلعۂ شر دستم سر ہو، یہ منشور ان کا — اہلِ باطل کے لیے وہ ہیں مکمل قزّاق
ان کا شیوہ سدا حق گوئی و حق جوئی ہے — اپنی تحقیق میں رہتے ہیں وہ حق کے مشتاق
ردّ باطل کے سبھی ان کو طریقے معلوم — حق کے حق میں سدا ہوتے ہیں بنائے احقاق

کیا ہیں وہ کیا نہیں، فہرست بہت لمبی ہے
مختصر ، پیکرِ اخلاص کا ان پر اطلاق

**مسلکی غیرت وحمیت:**

مسلکی غیرت وحمیت کے بارے میں خود بھٹی صاحب کی اپنی تحریریں ملاحظہ فرمائیں:

● ''میں چوں کہ فقہی اعتبار سے ایک خاص مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں اور اسی ماحول میں میری زندگی کی منزلیں طے ہوئی ہیں، اس لیے متعدد مقامات پر اس کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ میری مسلکی مجبوری ہے، جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ امید ہے کہ لائق احترام قارئین اسے برداشت کریں گے۔'' (گزر گئی گزران، حرفے چند، ص: ع)

● ''میرا مسلکی تعلق چوں کہ اہل حدیث سے ہے، اس لیے میں سب سے پہلے اسی جماعت کا تذکرہ کروں گا۔'' (گزر گئی گزران، ص: ۲۷۶)

● طالب علمی کے دور میں درسی کتابوں کے علاوہ اردو کی جو کتابیں میں نے پڑھیں، ان میں مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی (۔۱۳۳۶ھ) کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ یہ تاریخی ناول ہیں۔ ان کی زبان اور انداز سے میں بہت متاثر ہوا اور ان کے مطالعہ سے مجھے بے حد فائدہ پہنچا۔ یہ آج سے کم وبیش ستر سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد ان کتابوں کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ شرر سے مجھے اس لیے بھی دلچسپی ہوئی کہ کسی نے بتایا تھا کہ یہ اہل حدیث ہیں اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی (۔۱۹۰۲ء) کے شاگرد ہیں۔ (اور یہ بات صحیح تھی) (گزر گئی گزران، ص: ۱۶۰-۱۰۷)

● اپنے مسلک کے خلاف کبھی نہیں لکھا البتہ بعض اوقات لطیفے ہو جاتے ہیں اور لطیفہ بیانی ہر صاحب ذوق کی ذہنی غذا ہے۔ لطیفے کو لطیفہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اگر کسی نے میرے متعلق لکھا تو میں نے اس کا بھی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے میری وجہ سے اپنا جی خوش کر لیا تو مجھے خوشی ہوئی....

ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی غیر اہل حدیث نے میرے مسلک، میری جماعت یا میری جماعت کے کسی عالم کو ہدف تنقید ٹھہرایا یا کسی اسلوب میں نشانہ طنز بنایا تو میں

نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا۔ ایسے موقعے پر خاموش رہنا میری ذہنی افتاد اور میرے قلم کی فطرت کے خلاف ہے۔ (گزر گئی گزران: ۲۶۴)

● شاہ محمد جعفر پھلواری کی پرورش و پرداخت ایک خاص فقہی و دینی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے وہ بسا اوقات بدذوقی کی مثال وہابیت سے دیا کرتے تھے، اس پر بھٹی صاحب نے سن و سال کے تفاوت کے باوجود اپنے انداز میں ان کی سخت گرفت کی۔ (گزر گئی گزران: ۲۸۰)

● جماعت اسلامی والوں کو اس وقت تک سکون قلب حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مولانا مودودی کے لٹریچر یا جماعت اسلامی کا کسی صورت میں نام نہ لے لیں، بالکل اسی طرح جس طرح کہ میری اس وقت تک تسلی نہیں ہوتی جب تک کہ کسی انداز میں اہل حدیث کا ذکر نہ کرلوں۔ (بزم ارجمنداں: ۳۵۷)

**سیاسی و دینی جماعتوں کے بارے میں افادات:**

**جماعت مجاہدین (تحریک شہیدین):** تقریباً دو سو سال قبل ایک بے نام جماعت عالم وجود میں آئی جسے بعد میں ''جماعت مجاہدین'' کہا جانے لگا۔ یہ جماعت سید احمد شہید بریلوی (۱۲۴۸ھ)، مولانا اسماعیل شہید دہلوی (۱۲۴۸ھ) اور دیگر بہت سے علمائے کرام پر مشتمل تھی۔ اس جماعت (یا تحریک) کے دو اہم مقاصد تھے۔

ایک مسلمان بدعات، ہندوانہ رسوم اور شرکیات سے کنارہ کش ہو جائیں اور نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ اسلامی زندگی بسر کریں۔

دوسرا مقصد اس ملک سے انگریزی اثر و رسوخ کو ختم کرنا اور اس کے لیے باقاعدہ جہاد کی طرح ڈالنا تھا۔

اس ملک میں احیائے دین کی یہ پہلی تحریک تھی جس کا نقطہ نظر خالص کتاب و سنت کی ترویج و اشاعت اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دے کر غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنا تھا۔

جماعت مجاہدین نے ۱۸۲۶ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور آزادئ برصغیر یعنی ۱۹۴۷ء تک اس کی تگ و تاز مجاہدانہ جاری رہی۔ اس حساب سے اس جماعت نے ۱۲۱ سال کی طویل عمر پائی جس میں اس پر کئی دور آئے اور مختلف مراحل سے گزری۔ انگریزی حکومت نے اس کے کارکنوں کو گرفتار کیا، ان پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے، ان کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا، ان کو جیلوں میں ڈالا اور نوبت پھانسیوں تک پہنچی، اس جماعت کے اکابر کو جزائر انڈیمان (کالا پانی) بھیجا گیا۔ ابتداء میں احناف علمائے کرام بھی اس جماعت میں شامل تھے، لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ وہ ان سے الگ ہو گئے اور فقط اہل حدیث میدان میں رہ گئے۔ (گزر گئی گزران: ۲۹۷۔۳۰۶)

**آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس:** ۱۹۰۶ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز و تحریک سے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر آرہ میں جماعت اہل حدیث کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں جماعت کے بہت سے علمائے کرام اور سرکردہ حضرات نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تشکیل کی گئی۔ کانفرنس کے پہلے صدر مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (وفات: ۲۲ر نومبر ۱۹۱۸ء) اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی ۱۵ر مارچ ۱۹۴۸ء) کو منتخب کیا گیا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم کیا گیا۔ کانفرنس کے خازن مولانا شمس الحق عظیم آبادی (متوفی ۲۰ر مارچ ۱۹۱۱ء۔۱۳۲۹ھ) بنائے گئے تھے۔

کانفرنس کے تعارف اور اس کو منظم کرنے کی غرض سے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد بنایا گیا تھا جو مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (وفات ۱۷ر مارچ ۱۹۱۸ء) مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (وفات ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (وفات: ۱۹۴۸ء) پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں کانفرنس کے سالانہ جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ چلا۔ قیام پاکستان تک اس کے چوبیس جلسے ہوئے۔ کانفرنس کی طرف سے مبلغین مقرر کیے گئے تھے جو مختلف علاقوں میں جاتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ کانفرنس کی طرف سے تبلیغی رسائل بھی شائع کیے گئے۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا عبدالوہاب آروی کے زیر صدارت ۱۸، ۱۹، ۲۰ر جنوری ۱۹۵۷ء کو آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا ایک اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، جس میں اسے ''مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ (گزر گئی گزران: ۲۷۸۔۲۷۹)

**جماعت اسلامی:** ۲۵۔۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور کے علاقہ اسلامیہ پارک میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں یہ ۷۵ آدمیوں کا اجتماع تھا۔ مولانا مودودی کو امیر بنایا گیا۔ ان سطور کا راقم عاجز (یعنی مولانا بھٹی) بھی اجتماع میں شامل تھا۔ اس میں شامل ہونے والوں میں تین درجے بنائے گئے تھے، رکن، متفق، ہم درد۔ تینوں درجوں میں شمولیت کے لیے کچھ شرائط مقرر کی گئی تھیں۔ رکن کی شرائط بہت سخت تھیں۔

قیام جماعت کے بعد مولانا منظور نعمانی نے لمبی دعا فرمائی۔ لیکن اس سے تھوڑے عرصے کے بعد دعا کرنے والے مولانا منظور احمد نعمانی اور ان کے علاوہ سید ابوالحسن علی ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی اور مولانا نذیر الحق میرٹھی جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

پھر ۱۹۵۰ء میں حکیم عبداللہ روڑوی نے علیحدگی اختیار کر لی۔ ۱۹۵۷ء میں مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا عبدالغفار حسن اور دیگر بہت سے

حضرات نے اس جماعت سے اپنی وابستگی منقطع کر لی۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے اپنا نام متفقین میں اور میں نے ہمدردوں میں لکھوایا تھا۔ ہم دونوں پہلے اجلاس کے علاوہ کسی اجلاس میں شامل نہیں ہوئے۔ نہ ہم نے جماعت کی کسی تحریک میں کبھی حصہ لیا۔ بس وہی پہلا اور آخری اجلاس تھا، جس میں ہم شریک ہوئے۔

مولانا مودودی مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھوں نے سیاست بھی کی اور کئی سال جیلوں میں رہے۔ قرآنِ مجید کی تفسیر بھی لکھی اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ (ان سے بہت سے مسائل میں اتفاق واختلاف کے باوجود یہ حق ہے کہ) ان کے بعد اس جماعت کو اس مرتبے کا سربراہ نہ مل سکا اور بہ ظاہر نظر ملے گا بھی نہیں۔

جماعت اسلامی مولانا مودودیؒ کا تسلسل قائم نہ رکھ سکی۔ اس نے کلیتاً اپنے آپ کو سیاست کے حوالے کر دیا۔ (گزر گئی گزران: ۲۷۸۔۲۷۹)

**جمعیت علمائے ہند:** نومبر ۱۹۱۹ء میں سب مذہبی جماعتوں کا ایک جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ نے علماء کی ملک گیر تنظیم کی تشکیل کی تجویز پیش کی جو متفقہ طور پر ملک اور قوم کی خدمت کر سکے۔ بہتر ہوگا کہ علماء کی ایسی تنظیم قائم کی جائے جو مذہبی اور سیاسی معاملات میں اسلام کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے۔ اس سے علماء کا وقار بڑھے گا اور آپس کے مذہبی اور مسلکی جھگڑوں میں کمی آئے گی۔ نیز اس طرح علماء کی وساطت سے اسلام کی آواز زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر شکل اختیار کرے گی۔ مولانا کی یہ تقریر سن کر حاضرین کی اکثریت نے ان کی تائید کی اور غور وفکر کے بعد اس تنظیم کا نام ''جمعیت علمائے ہند'' رکھا گیا۔ (گزر گئی گزران: ۲۸۱)

دہلی کے اجلاس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز سے اس کے صدر مفتی کفایت اللہ اور ناظم اعلیٰ مولانا سعید احمد دہلوی کو بنایا گیا۔ امرتسر کے اجتماع میں تینیس ارکان پر مشتمل جمعیت کی مجلس عاملہ تشکیل دی گئی، جس میں ملک کے تمام صوبوں کو الگ الگ نمائندگی دی گئی۔ پنجاب سے مجلس عاملہ کے تین حضرات لیے گئے تھے، وہ تھے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ (تینوں اہل حدیث تھے)

امرتسر ہی میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء اور یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو جمعیت علمائے ہند کا اجلاس عام بہ صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی منعقد ہوا۔ اس کا خطبہ استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پڑھا۔ اس سے قبل اسی پنڈال میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ حکیم محمد اجمل خاں کی صدارت میں ہوا تھا، اس کا خطبہ استقبالیہ بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پڑھا تھا۔ تمام سیاسی جماعتیں اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف متحد تھیں اس لیے اسی پنڈال میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں مجلس خلافت کا اور اسی پنڈال میں موتی لال نہرو کے زیر صدارت آل انڈیا کانگرس کا جلسہ منعقد ہوا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس ملک سے انگریزوں کے نکل جانے کے متعلق پہلی آواز جمعیت علمائے ہند کے بانی علمائے دین نے اٹھائی اور اس موضوع کی اولین قرارداد انھیں بوریانشینوں کے پہلے جلسۂ عام میں امرتسر میں منظور کی گئی۔

جماعت اہل حدیث کے بعض دوست اس کا ذکر تو بار بار کرتے ہیں کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ۱۹۱۹ء کے مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا، لیکن اسی پنڈال میں انھوں نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں جو خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا، اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ بھی نہیں بتایا جاتا کہ اس وقت سب جماعتیں متحد تھیں جن میں کانگرس اور مسلم لیگ بھی تھیں اور ان تمام جماعتوں کے اجلاس یکے بعد دیگرے ایک ہی پنڈال، ایک ہی مہینے اور ایک ہی شہر میں منعقد ہوئے تھے۔ اس کا اظہار بھی نہیں کیا جاتا کہ جمعیت علمائے ہند کا قیام مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز سے عمل میں آیا تھا۔ اس سیاسی حقیقت کا جماعت اہل حدیث کی موجودہ نسل کو شاید علم بھی نہ ہوگا۔ اس کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ یہ اتحاد ٹوٹ گیا اور پھر مولانا ثناء اللہ امرتسری کا مسلم لیگ سے تعلق قائم نہیں رہا۔

یہاں میرا مقصد صرف جمعیت علمائے ہند کے قیام کے متعلق عرض کرنا تھا۔ اس کے بعض اجلاسوں میں جو تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل منعقد ہوئے میں بھی شریک ہوا۔ (گزر گئی گزران: ۲۸۲۔۲۸۳)

**مجلس احرار:** ۱۹۲۸ء میں مجلس احرار اسلام قائم ہوئی۔ جن حضرات نے یہ جماعت قائم کی وہ تھے مولانا ظفر علی خاں، غازی عبدالرحمٰن امرتسری، چودھری افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبدالغفار غزنوی اور بعض دیگر حضرات۔

مجلس احرار کے بانی انگریزی حکومت کے شدید مخالف اور زوردار مقرر تھے۔ مولانا ظفر علی خاں جلد ہی اس جماعت سے علیحدہ ہوگئے تھے اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ احرار کی سخت مخالفت کرنے لگے تھے۔

احرار رہنماؤں نے برصغیر کی آزادی کے لیے بے پناہ قربانیاں دیں۔ احرار جیسے پرجوش اور حوصلہ مند نہ کسی سیاسی جماعت میں ور کر پیدا ہوئے اور نہ اس قسم کے بے دھڑک اور بے خوف مقرر کسی جماعت کو نصیب ہوئے۔ (گزران: ۲۸۳۔۲۸۴)

**جمعیت علمائے اسلام:** ۱۹۴۶ء میں ''جمعیت علمائے ہند'' کے مقابلے میں ''جمعیت علمائے اسلام'' بنائی گئی۔ اس کا پہلا اجلاس جسے تاسیسی اجلاس کہنا چاہیے کلکتہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے زیر صدارت ہونا قرار پایا تھا، لیکن مولانا ممدوح ناسازیٔ طبع کی بنا پر اس اجلاس میں شامل نہیں ہو سکے تھے، اس کی صدارت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے کی۔ اس جماعت کے صدر مولانا عثمانی اور نائب صدر مولانا سیالکوٹی بنائے گئے۔ یہ جماعت دو قومی نظریہ کی مبلغ اور مسلم لیگ کی جاری

کردہ تحریک پاکستان کی موید تھی۔ جمعیت علمائے ہند کے نقطہ نظر کے بالکل مخالف۔ (گزران:۲۸۶)

پھر ایک وقت آیا کہ یہ صرف بعض دیوبندی حضرات کی جماعت ہو کر رہ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے تین حصے ہوگئے۔ ایک حصے پر فضل الرحمٰن نے قبضہ کرلیا اور اس کا نام جمعیت علمائے اسلام (ف) رکھا۔ دوسرا حصہ ہمارے دوست مولانا سمیع الحق کے زیرنگرانی آیا اور اسے جمعیت علمائے اسلام (س) کہا جانے لگا۔ تیسرا حصہ جو بہت ہی مختصر تھا، مولانا احمد علی کے پوتے محمد اجمل قادری نے لے لیا، یہ حصہ جمعیت علمائے اسلام (ق) کہلایا۔ ان تینوں حصوں یعنی (ف، س، ق) کے مجموعے کو ایک بامذاق دیوبندی عالم نے ''فسق'' کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اجمل قادری صاحب نے اپنی جماعت کو مولانا سمیع الحق کے حوالے کردیا۔

بعض دیوبندی علمائے کرام جمعیت علمائے اسلام کو جمعیت علمائے ہند کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ جمعیت علمائے ہند ایک قومی نظریے کی حامی اور تحریک پاکستان کی مخالف تھی۔ جب کہ جمعیت علمائے اسلام دوقومی نظریہ رکھتی تھی اور پاکستان کی حامی تھی۔ اس کا قیام ہی جمعیت علمائے ہند کے خلاف عمل میں آیا تھا۔

جمعیت علمائے اسلام دراصل مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریک سے قائم ہوئی تھی اور اس کے قیام کے زمانے میں یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ اس میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنی کی معاصرت کا عنصر کارفرما ہے۔ مولانا مدنی اصلا دیوبند کے رہنے والے نہیں تھے، کسی دوسرے علاقے (ٹانڈہ، یو۔پی) سے تعلق رکھتے تھے، لیکن دیوبند کی وجہ سے ملک کے تدریسی اور سیاسی حلقوں میں انھوں نے جو شہرت پائی وہ مولانا عثمانی کو حاصل نہ ہوئی، جس کی وجہ سے ان کے دل میں رقابت کا جذبہ ابھر آیا۔ چنانچہ سیاسی میدان میں مقابلہ کے لیے انھوں نے جمعیت علمائے اسلام قائم کرلی۔ تدریسی سلسلے میں وہ اس سے بہت عرصہ قبل (۱۹۲۸ء میں) دارالعلوم دیوبند سے الگ ہوکر ڈابھیل چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے تدریسی سلسلے میں بہت خدمات انجام دیں۔ ان کی سیاست پر ان کی تدریس وتصنیف کو فوقیت حاصل ہے۔ (گزرگئی گزران:۲۸۶۔۲۸۷)

**خاکسار تحریک:** علامہ عنایت اللہ مشرقی نے ۱۹۳۰ء میں خاکسار تحریک کا آغاز کیا، جب خاکسار کی پالیسیوں کے سبب حکومت نے اس کے خلاف ظلم وتشدد اور دارودگیر کا سلسلہ شروع کیا تو چار ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ وہ تھے (معروف اہل حدیث وکیل) میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بارایٹ لا)، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، خالد لطیف گابا اور سید حبیب (جو اس وقت لاہور کے ایک روزنامہ اخبار ''سیاست'' کے ایڈیٹر تھے) میاں عبدالعزیز اس کمیٹی کے چیرمین تھے۔ (وہ مسلکاً اہل حدیث تھے)

علامہ مشرقی مولویوں کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے خاکساروں کو حکم دیا تھا کہ مولویوں کی بات نہ مانو، نہ اس کا اعتبار کرو۔ (گزرگئی گزران:۲۹۴)

لیکن جب خاکساروں پر مصیبت آئی تو مولویوں ہی نے تمام تلخیوں کو بھلا کر ان کی مدد کی۔

بعد میں اس تحریک کو اس کے بانی مشرقی نے تحلیل کردی۔

**خدائی خدمت گار:** ۱۹۲۹ء میں خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی معروف بہ ''باچہ خاں'') نے صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گار کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ ۱۹۱۹ء میں انھوں نے رولٹ بل کے خلاف ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ اس جلسے کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔

رہائی کے بعد اپنے علاقے میں ایک سکول کھولا اور صوبہ سرحد میں اس کی شاخیں قائم کرنے کے لیے دورہ کیا جو انگریزی حکومت کو ناگوار گزرا اور ان سے قانونِ انسدادِ جرائم کے تحت ضمانت طلب کرلی گئی۔ ضمانت نہیں دی تو انھیں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا اور تین سال کی بامشقت قید ہوئی۔ بہ الفاظ دیگر انھیں اپنی قوم کو تعلیم دینے کے جرم میں تین سال کی سزا دی گئی۔

۱۹۲۴ء میں وہ جیل سے رہا ہوئے تو اپنے صوبے میں بیاہ شادیوں اور دیگر تقریبات کی غلط رسوم کو ختم کرنے اور وفات کے بعد جو غیر اسلامی رسمیں مروج ہوگئی ہیں ان کے خاتمے کی مہم شروع کی اور اصلاحی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ پھر اپنی جماعت کا نام خدائی خدمت گار رکھ کر صوبے میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کردیا۔

۱۹۳۰ء میں وہ باقاعدہ کانگرس میں شامل ہوگئے۔ ان کی جماعت ''خدائی خدمت گار'' کا تعلق بھی کانگرس سے ہوگیا۔ اس جماعت کی سرگرمیوں کے بھی بہت سے پہلوؤں کو ہم نے دیکھا۔ ان کی وفات پر میں نے اہل حدیث میں مضمون لکھا۔

اس خاندان کے تمام افراد کئی پشتوں سے حریت وآزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے خاندان کے مختلف افراد نے سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے جہاد میں بھی مجاہدانہ تگ وتاز کی تھی اور بہادری وشجاعت کے جوہر دکھائے تھے۔ خان عبدالغفار خاں کو یہ جذبہ ورثے میں ملا تھا۔ انھوں نے ہر اس تحریک کا ساتھ دیا جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی خواہاں تھی اور جس کا مقصد اس خطۂ ارض کو ہم کنارِ حریت کرنا تھا۔ خان عبدالغفار کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالجبار خان نے بھی جنھیں ''ڈاکٹر خاں'' کہا جاتا ہے، ان تحریکوں کا پورا ساتھ دیا جو برصغیر سے انگریزوں کو نکالنے کے متمنی تھیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور کئی سال ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہے۔

''وہ قیامِ پاکستان کے مخالف تھے لیکن جب پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو انھوں نے اس کی حمایت میں پارلیمنٹ میں تقریر کی اور اس میں کہا کہ: ''میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کو ایسی ریاست بنانے کے آرزومند ہیں، جس کا نظامِ حکومت، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی روایات کے مطابق ہو۔''

ہمیں افسوس ہے کہ ان کی وفات کے بعد جماعت اہلِ حدیث کے دو اخباروں (ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور ''خدام الدین'') کے سوا کسی مذہبی اور دینی اخبار نے ان کی سعی مخلصانہ اور تگ و تازِ مجاہدانہ کا اعتراف نہیں کیا۔ ہم ان دونوں مؤقر اخباروں کو ان کی حق گوئی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

پھر نہایت تاسف کی بات یہ ہے کہ کسی مذہبی یا نیم اسلامی اور نیم سیاسی جماعت کے کسی چھوٹے بڑے رہنما نے اس مردِ مجاہد کی وفات پر اظہارِ تعزیت نہیں کیا۔

اب خان عبدالغفار خان کے بیٹے خان عبدالولی خاں کے متعلق ایک واقعہ سنیے!

''۱۹۷۷ء میں جب بعض سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے امریکہ کی انگیخت پر ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک چلائی تھی ان دنوں بھٹو نے ازراہ مزاح کسی مجلس میں کہا کہ ہمارے علمائے کرام حلوہ کھانے والے ہیں۔ بھٹو کے اس مزاح کا ردِّعمل یہ ہوا کہ ان لوگوں نے دربار صاحب میں یعنی حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حلوے کھانے شروع کر دیے۔ حلوے کی دیگیں وہاں آ رہی ہیں اور تحریک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین جن میں جمعیت علمائے پاکستان کے ساتھ جماعت اسلامی اور مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام کے اکابر و اصاغر بھی شامل تھے، حلوے کھا رہے ہیں۔ انھی دنوں خاں عبدالولی خاں لاہور آئے تو کسی نے کہا کہ ''داتا صاحب تشریف لے جائیے، وہاں حلوے کی دیگ کسی نے بھیجی ہے۔'' اس وقت عبدالولی خاں کی اہلیہ بیگم نسیم ولی خاں بھی وہاں موجود تھیں۔

عبدالولی خاں مرحوم نے جواب دیا، ہمارے اسلاف کا تعلق مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین سے رہا ہے۔ اس لحاظ سے آپ ہمیں وہابی سمجھیے۔ ہم صرف اللہ کو داتا مانتے ہیں، وہی سب کو دیتا ہے۔ میں نہ کبھی کسی مزار پر گیا ہوں اور نہ کبھی نذر و نیاز کی کوئی چیز کھائی ہے۔ ہمارا بھٹو سے سیاسی اختلاف ہے۔ مزاروں پر حلوے کھانا کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر اپنی بیگم کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ حلوہ کھانے کے لیے جانا چاہتی ہیں تو چلی جائیں۔ میں اس قسم کے کام نہیں کرتا۔

یہ تھے عبدالغفار خاں اور عبدالولی خاں کے مذہبی اور دینی افکار۔

رہے سیاسی معاملات تو یہ کوئی دینِ اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جو شخص جس سیاسی جماعت کو ملک و ملت کے لیے صحیح سمجھتا ہے، اس سے وابستہ ہو جائے اور ملک، قوم اور ملت کی خدمت کرے۔ اگر کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو بےشک نہ رکھے۔ نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے کو اللہ تعالیٰ نے جنت الفردوس کی خوش خبری سنائی ہے، نہ تعلق نہ رکھنے والے کو کسی قسم کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔'' (گزر گئی گزران: ۳۱۳۔۳۲۰)

**رولٹ بل اور اس کے نتائج:**

جنگِ عظیم اول (جولائی ۱۹۱۴ء تا اکتوبر ۱۹۱۸ء) کے بعد ایک وقت آیا کہ کانگرس، مسلم لیگ اور مجلس خلافت آزادیٔ وطن کے لیے متحد تھیں۔

اس کے بعد انگریزی حکومت نے ہندوستان کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا اس کی اصل بنیاد رولٹ بل تھا، جسے آج سے کم و بیش ۹۰ رسال قبل کے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں نہایت اذیت ناک باب کی حیثیت حاصل تھی۔ مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر یہ تھا:

اس دور کے وزیرِ ہند منسٹر مانٹیگو نے ۱۰ راگست ۱۹۱۷ء کو اعلان کیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد برطانوی حکومت ہندوستان میں بہ تدریج ایسی ذمہ دار حکومت قائم کر دے گی جو اسی ملک کے لوگوں پر مشتمل ہوگی اور انہیں کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ لیکن اس کے بجائے اختتامِ جنگ کے دو مہینے پہلے (۱۶ راگست ۱۹۱۸ء) کو حکومت نے اعلان کیا کہ آئندہ اہلِ ہند کو فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدوں سے نوازا جائے گا۔ اس اعلان سے ملک کی سیاسی جماعتوں میں بددلی پیدا ہو گئی اور ان کے رہنما سوچنے لگے کہ کہاں ذمہ دار حکومت اور کہاں فوج کی اعلیٰ ملازمت؟

اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ۱۸ ردسمبر ۱۹۱۸ء کو بنگال کے مولوی فضل الحق کے زیرِ صدارت دہلی میں مسلم لیگ کا جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ حکومت نے ان کا خطبۂ استقبالیہ تو ضبط کر لیا تھا، لیکن جلسے کے مقررین کی تقریروں کے کچھ حصے اخبارات میں شائع ہو گئے تھے۔ اس جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس نے ہندوستان کے لوگوں سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کیا جائے اور انھیں اپنے ملک پر حکومت کرنے کا حق دیا جائے۔ اس قرارداد کی تائید میں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا عبدالقادر قصوری، مفتی کفایت اللہ اور مولانا آزاد سبحانی نے تقریریں کیں۔

رولٹ بل کے خلاف ۶ راپریل ۱۹۱۹ء کو پورے ملک میں ہڑتال کا اعلان کیا گیا چنانچہ اس اعلان پر عمل ہوا اور ملک کے تمام شہروں اور قصبوں میں ہڑتال کی گئی۔ اس سے چار دن بعد امرتسر میں رولٹ بل کے خلاف شدید ہنگامے ہوئے۔ پنجاب کی حکومت نے ڈاکٹر سیف الدین کچلو (جو مسلکاً اہلِ حدیث تھے) اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا، جس پر پورے شہر میں احتجاج ہوا۔ پھر بہت جلد پنجاب کے دوسرے شہروں اور علاقوں تک احتجاج کا دائرہ پھیل گیا پنجاب کے گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے صوبے میں مارشل لا لگا دیا اور لوگوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔

۱۳ راپریل کو بھی ہڑتال تھی اور امرتسر کے جلیاں والا باغ میں احتجاجی جلسے کا

اعلان کیا گیا تھا۔ لوگ جلسے میں پہنچے تو گورنر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے انگریزی فوج کے سربراہ جنرل ڈائر نے گولی چلادی، جس سے چار سو سے زائد آدمی ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوگئے۔ اس شدید الم ناک حادثے کے بعد لوگوں میں مزید جوش و خروش پیدا ہوگیا اور حالات بالکل بدل گئے۔

جلیاں والا باغ کے حادثے سے ٹھیک بیس سال گیارہ مہینے بعد ۱۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب کے ایک شخص اودھم سنگھ نے سر مائیکل اوڈوائر کو گولی کا نشانہ بنایا۔ اس دن سر مائیکل اوڈوائر کا لندن کے کاکسٹن ہال میں ایک جلسے میں تقریر کرنے کا پروگرام تھا۔ جلسے کی صدارت سیکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ زٹلینڈ کر رہا تھا۔ اودھم سنگھ پستول میں گولیاں بھر کر اس جلسے میں پہنچا مائیکل اوڈوائر کی تقریر اس نے سنی۔ جب وہ تقریر ختم کر کے کرسی پر بیٹھنے کے لیے پیچھے کو گھوما تو اچانک ہال میں گولیاں چلنے لگیں جو اوڈوائر کے سینے میں پیوست ہوگئیں اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس کا جسم لہو سے تر تھا اور زخموں کی شدت سے وہ اسی وقت مر گیا۔ اس طرح اودھم سنگھ نے اس سے ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کے حادثے کا انتقام لے لیا۔

پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام ''رام محمد سنگھ آزاد'' بتایا۔ اس عجیب وغریب نام کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ اس نام کے تینوں اجزاء ہندو، مسلم، سکھ اتحاد کے مظہر ہیں۔ جلیاں والا باغ میں اوڈوائر کے حکم سے تینوں قوموں کے لوگوں پر گولی چلائی گئی تھی اور انھیں قتل کیا گیا تھا۔

سر مائیکل اوڈوائر کے قتل کی خبر سب سے پہلے رات کو آٹھ بجے برلن ریڈیو سے نشر ہوئی۔ خبر سنانے والے کا نام ملک عبدالرؤف تھا (جو مسلکاً اہل حدیث تھے) وہ گوجراں والا کی معروف علمی شخصیت ملک عبدالقیوم مرحوم (سابق پرنسپل لا کالج لاہور) کے بھائی تھے۔

جب اتحادی فوجوں نے (جو برطانیہ، فرانس، روس، چین اور امریکہ پر مشتمل تھیں) برلن پر تابڑ توڑ حملے کیے اور ان حملوں میں ہٹلر مارا گیا تو اس اثناء میں ملک عبدالرؤف بھی حملوں کی زد میں آکر موت کی آغوش میں چلے گئے اور برلن ریڈیو سے ان کی زوردار آواز ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی۔ یہ ۱۹۴۵ء اپریل کا مہینہ تھا۔ (گزر گئی گزران: ۳۲۰۔۳۲۳)

**آزاد ہند فوج (INA):** دوسری جنگ عظیم (یکم ستمبر ۱۹۳۹ء تا جولائی ۱۹۴۵ء) میں شامل ہونے والے بعض ہندوستانی فوجیوں نے ایک آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) بنائی تھی، جسے (آئی این اے) کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ فوج میں بھرتی تو انگریزی حکومت کی مدد کے لیے ہوتے تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ جاپان، جرمنی، اٹلی (جن کے لیے ''محوری'' کی اصطلاح بنائی گئی تھی) اتحادی فوجوں (برطانیہ، فرانس، امریکہ) کے مقابلے میں کامیابی کی طرف بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے اتحادی افواج سے الگ ہو کر جاپان اور جرمنی وغیرہ سے تعلق پیدا کر لیا اور اپنی اس باغی فوج کو انھوں نے آزاد ہند فوج (یا انڈین نیشنل آرمی) کے نام سے موسوم کیا۔ اس کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی لیکن بعد میں پھر اس کی تجدید سبھاش چندر بوس اور جنرل شاہ نواز وغیرہ نے کی۔ حکیم عبدالسلام ہزاروی (جو مسلکاً اہل حدیث تھے) کی مدد سے سبھاش چندر بوس براہ چمرکنڈ بھیس بدل کر کابل پہنچے اور وہاں سے جرمنی گئے، سبھاش چندر بوس کے جرمنی پہنچنے کی خبر پھیلنے کے بعد حکیم صاحب کا راز فاش ہونے پر انھیں گرفتار کر کے دیولالی کیمپ (راجپوتانہ) پہنچا دیا گیا۔ ایک عرصے تک کسی کو پتا نہ چل سکا کہ حکیم صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ساڑھے تین سال حکیم صاحب وہاں قید رہے۔ ڈیڑھ سال بعد پتا چلا کہ وہ دیولالی کیمپ میں قید ہیں۔

آزاد ہند فوج میں مسلمان، ہندو، سکھ سبھی شامل تھے جن کی تعداد چالیس ہزار کے قریب تھی۔ سب کو سخت اذیتیں دی جاتی تھیں، پنڈت جواہر لال نہرو نے حکومت سے اس سلسلے میں وضاحت طلب کی اور جب ۲۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو پونا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر صدارت آل انڈیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس میں آزاد ہند فوج کے گرفتار شدہ لوگوں کا قانونی دفاع کے لیے ڈیفنس کمیٹی بنائی گئی جس میں معروف ترین اہلِ حدیث وکیل میاں عبدالعزیز مالوداڑہ بھی تھے۔ (گزر گئی گزران: ۳۲۳۔۳۳۱)

**پرجا منڈل (ریاست فرید کوٹ):** اس منڈل کے صدر گیانی ذیل سنگھ (سابق صدر جمہوریہ ہند) اور جنرل سکریٹری مولانا محمد اسحاق بھٹی تھے۔ ریاستی پیمانے پر یہ آزادی کی تحریک تھی جس میں بہت سے لوگ شامل ہوئے اور قید و بند کی سزائیں جھیلیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی مداخلت سے وہ لوگ رہا ہوئے۔

ملک تقسیم ہوگیا تو مولانا بھٹی پاکستان منتقل ہوگئے اور گیانی ذیل سنگھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوئے بعد میں صدر جمہوریہ کے اعلیٰ منصب تک پہنچے۔

## اہم شخصیات سے ملاقاتیں:

مختلف میدانہائے عمل سے تعلق رکھنے والی بہت سی شخصیات ہیں جن سے مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کے مراسم تھے یا ان سے ملاقاتیں ہوئیں ان میں سے چند شخصیات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

- امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۰۸۔۱۹۵۸ء) (وزیر تعلیم۔ ہند)
- سید عطاء اللہ شاہ بخاری (دنیائے خطابت کے ممتاز ترین خطیب)
- سید محمد داؤد غزنوی (پندرہ سال ان کی خدمت میں رہے)۔
- مولانا محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ (امیر جمعیت اہل حدیث پاکستان) استاذ تھے۔
- مولانا محمد گوندلوی (استاذ)
- مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی (استاذ)

● خواجہ عبدالحمید (۱۹۶۲ء) (بیرسٹر ۱۹۱۹ء کی تحریک موالات میں وکالت ترک کی اور دوبارہ اس پیشے میں نہیں آئے)

● مسٹر جے پرکاش نارائن (مشہور سوشلسٹ لیڈر)

● گیانی ذیل سنگھ (سابق صدر جمہوریہ ہند، ریاست فرید کوٹ میں آزادی سے قبل، پرجامنڈل کے صدر اور بھٹی صاحب جنرل سیکریٹری تھے)

● پنڈت جواہر لال نہرو (ہندوستان کے پہلے وزیراعظم)

● ٹیکا رام سخن (کمیونسٹ مقرر)

● مولانا ابو یحی خان نوشہروی (مصنف تراجم علمائے اہل حدیث ہند)

● مولانا سید سلیمان ندوی۔ (استاذ العلماء)

● جسٹس منیر (۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۴ء کو مرکزی اسمبلی (پاکستان) کو توڑی تھی)

● خلیفہ عبدالحکیم (صدر ادارہ ثقافت اسلامیہ)

● قاضی عبدالعلی بی اے (ریاست فرید کوٹ کے پہلے یا دوسرے بی اے)

● مولانا ظفر علی خان (ایڈیٹر زمین دار، مشہور شاعر و ادیب اور سیاسی رہنما)

● مولانا غلام رسول مہر (عظیم مورخ و مصنف)

● پروفیسر حمید احمد خاں (وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، ایڈیشنل ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

● مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (مشہور مصنف و داعی)

● مولانا محمد حنیف ندوی (رفیق کار ادارہ ثقافت اسلامیہ)

● مولانا رئیس احمد جعفری (رفیق کار)

● مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی (رفیق کار)

**بھٹی صاحب کیا کیا نہیں ہیں اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:**

● نہ میں کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کا لیڈر ہوں، نہ خطیب اور مقرر ہوں، نہ بہت بڑا مصنف اور ادیب ہوں، نہ سیاح اور جہاں گرد ہوں، نہ کسی محکمے کا سربراہ ہوں، نہ حاکم یا وزیر ہوں، نہ صنعت کار یا کارخانہ دار ہوں۔ (گزر گئی گزران: حرفے چند: ج)

● اپنی کتاب ''گزر گئی گزران'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اسے داستانِ حیات بھی کہا جاسکتا ہے، سفر زندگی بھی قرار دیا جاسکتا ہے، لوح زیست کے نام سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے، عمر رفتہ کی بے مقصد کہانی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چند نقوش قدم بھی کہا جاسکتا ہے، ایک فقیر ناتواں کی روداد شب و روز بھی کہا جاسکتا ہے، ایک گم نام مسافر کا سفرنامۂ حیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ چوں کہ میں نے اسے زندگی کے آخری دور میں لکھا ہے، اس لیے اسے حرفِ آخر یا زندگی کی آخری منزل بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اسے ''گزر گئی گزران'' سے تعبیر کیا جائے۔ اگر قارئین محاورہ پورا کرنا چاہیں تو اس کے ساتھ ''کیا جھونپڑی کیا میدان'' کا اضافہ کرلیں۔'' (گزر گئی گزران، حرفے چند، ص: س)

برادرِ گرامی عارف جاوید محمدی کے مطابق آیت کریمہ ''فبای آلاء ربکما تکذبان'' کا اضافہ بھی برمحل ہے۔

**راقم پر علامہ بھٹی کے احسانات:**

❁ دور حاضر میں جن سربرآوردہ اہل قلم اور اصحاب فکر کی اردو تحریروں سے طبعی مناسبت رہی اور انھیں پڑھنے سے قلبی اطمینان و سکون ملا، ان میں بھٹی صاحب سرفہرست ہیں، ان کی کتاب ''دبستان حدیث'' میں راقم کا ''غائبانہ ترجمہ'' شامل ہے، اس کے بعد کویت میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انکی مجلسوں سے استفادے کا موقع بھی میسر آیا۔ ان کا اور ان کی مجلسوں کا خلاصہ میری نظر میں درج ذیل اشعار میں موجود ہے:

''ذکر اسلاف'' سے معمور، ادھر زندہ دلی — ان کی صحبت سے ہمیں سوز ملا ساز ملا

قابلِ رشک ہے یہ سادگی و بے نفسی — ان کے اخلاق کریمہ سے یہ انداز ملا

ملاقات کے بعد ان سے تعلق خاطر میں مزید اضافہ ہوا، جو ''پہلو'' ان کی تحریروں میں میرے لئے زیادہ جاذب نظر ہے وہ مسلک کی ترجمانی اور بروقت اس کا دفاع، ان کی تحریروں میں اس پہلو کو کبھی دبتے ہوئے نہیں دیکھا:

ایک مرکز پر سمٹ آیا جہانِ آرزو — کثرت موہوم سے جب دل پریشاں ہوگیا

چونکہ راقم بھی اپنی کم علمی کے باوجود اپنے مسلک کے سلسلے میں اسی عہد و پیمان کا پابند ہے اس لئے تاثر پذیری میں کوئی اجنبیت حائل نہ ہوئی۔

فرق یہ ہے کہ ہمارے بزرگ کا یہ کام بڑے پیمانے پر اردو میں ہزاروں صفحات میں پھیلا ہوا ہے اور اس موضوع پر راقم کا یہ کام (یعنی اپنے مسلک کی وضاحت اور دفاع) اس وقت تقریباً دو ہزار صفحات ہے اور وہ بھی عربی میں۔

● مولانا بھٹی صاحب اپنے سوانحی خاکے میں صاحب ترجمہ کو حسب حال وضرورت نقد و ظرافت اور تنبیہات و گذارشات سے بھی نوازتے رہتے ہیں، اس سلسلے میں جس فراخ دلی کا ثبوت میرے حالات زندگی میں دیا ہے وہ ان کے تحریر کردہ مختصر تراجم میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، بارہ صفحات کے ترجمے میں تقریباً چار صفحات نقد و تبصرے اور گذارشات پر مشتمل ہیں، جن سے میں نے بھرپور استفادہ کیا ہے، بہ صمیم قلب علمی کاموں پر ان کی مبارک بادی اور پھر ان کی تنبیہات و گذارشات کا احسان مند ہوں۔

● مصلحت کوشی کے اس دور میں ایسے بے نفسوں کی بے حد کمی ہے جو بے لاگ

تبصرے سننے کے خود بھی عادی ہوں، اور دوسروں کو سنا کر ان کو بھی متنبہ کریں۔

اب ان تنبیہات وگذارشات سے میرا استفادہ ملاحظہ فرماتے ہوئے یہ شعر بھی گنگنا سکتے ہیں:

بڑا ہوشیار ہوتا ہے بکار خویش دیوانہ ملا دیتا ہے ان کے ذکر میں اپنا بھی افسانہ

● (۱) بچپن ہی سے شعروشاعری سے دلچسپی تھی اور طبیعت میں موزونی بھی، جماعت ثانیہ (مولوی) کا طالب علم تھا، ۱۹۶۸ء میں اجلاس عام مدرسہ شمس العلوم سمرا (سدھارتھ نگر، یوپی) کے لئے نظم استقبالیہ لکھی، اسے سننے کے بعد اسٹیج سیکریٹری (جماعت کے کہنہ مشق شاعر اور سحر البیان خطیب مولانا انجم جمال اثری) نے فرمایا کہ ''اگر یہ بچہ شاعری کرتا رہا تو اپنے دور کا اقبال ہوگا''

حالات کی ستم ظریفی کہیے کہ ۱۹۷۸ء میں مدینہ یونیورسٹی کے لیے رخت سفر باندھتے وقت میں نے جذبات سے مغلوب ہوکر شاعری سے توبہ کر لی اور بقول بھٹی صاحب ''شاعری کا گلہ گھونٹ دیا''۔

● میں اپنے اس رویہ کے سبب جناب بھٹی صاحب کی ظرافت نما تنقید یا تنقید نما ظرافت کی زد میں آیا، ارشاد گرامی ملاحظہ ہو:

''میرے خیال میں یہ محض تکلف ہے، نہ شعر کہنا اور اس سے نفرت کرنا دینداری ہے اور نہ ترک شعر گوئی کی دعا کرنا مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کے شرائط میں شامل ہے، بلکہ شعر گوئی ذوق کی بلندی کی علامت ہے اور کسی عالم دین کا شاعر ہونا اس کی قابلیت کا ایک اضافی اعزاز ہے۔۔۔'' (دبستان حدیث:۶۲۴)

تقریباً ترک شاعری کے تینتیس سال بعد اس بے لاگ تبصرے نے مجھے جھنجھوڑا، ''دبستان حدیث'' کے متعارف قارئین کو بھی مجھے چھیڑنے کا مناسب موقع ہاتھ آ گیا، ۶ رجنوری ۲۰۱۱ء کو اس لمبی مدت کے بعد پھر طبع آزمائی شروع ہوئی اور ایک سال کے اندر شاعری نہیں تک بندی کے چار مجموعے (''مسدس شاہراہ دعوت''، ''الوداع''، ''محاسن اسلام'' اور ''پاکیزہ شاعری: ضرورت واہمیت'') تیار ہوئے، پہلے تینوں مجموعے مطبوع اور چوتھا زیر طباعت ہے:

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ ودمن مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

میں نے ''مسدس شاہراہ دعوت'' کی قافیہ پیمائی کے وقت طے کر لیا تھا کہ مولانا بھٹی صاحب سے اس تنقید کا انتقام ضرور لینا ہے، چنانچہ اس مجموعے کا ان کی طرف انتساب کر کے اور اس پر ان سے ''حرف چند'' (مقدمہ) لکھوا کر لے ہی لیا، ''انتساب'' کے کلمات درج ذیل ہیں:

''برِ صغیر کے مشہور مؤرخ، نامور صحافی اور عظیم سوانح نگار
علامہ محمد اسحاق بھٹی۔ حفظہ اللہ۔ (اب رحمہ اللہ)
کے نام

یہ ''مسدس'' ان کی کتاب ''دبستان حدیث'' میں میرے ''ترک شاعری'' پر ''تبصرہ'' کی رہین منت ہے''۔

میرے علم کے مطابق بفضلہٖ تعالیٰ اس ''مسدس'' پر اب تک کے تقریباً بیس جرائد ومجلّات میں مختلف شعراء اور دیگر باذوق حضرات کے منثور ومنظوم تبصرے شائع ہو چکے ہیں، اور سلسلہ جاری ہے۔

برِ صغیر کے گوشہ نشین خزینۂ معلوماتِ عامہ، تاریخ وثقافت اور شعروادب کے ممتاز مبصر اور میدان صحافت میں آبروئے جماعت علامہ ابن احمد نقوی نے مولانا بھٹی صاحب کی طرف کتاب کے انتساب پر فرمایا:

''گویا علامہ بھٹی کی تحریر نے شیخ صلاح الدین مقبول کے حق میں وہ کام کیا جو اقبال کے ''ترک شاعری'' کے معاملہ میں پروفیسر آرنلڈ کی رائے نے کیا تھا'' (مسدس: ص ۳۷)

مسدس کا پہلا ایڈیشن (۸۳۴) ابیات پر مشتمل تھا، اب وہ دوسرے ایڈیشن کے لیے اصلاح اور حذف واضافے کے مرحلے سے گذر رہا ہے، جس میں اب تک اشعار کی تعداد تقریباً (۱۷۰۰) پہنچ گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ بھٹی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور میرے اس مجموعے کو دنیا وآخرت میں درجۂ قبولیت سے نوازے۔ مسدس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

وجہ تالیف ہے حالی کے ''مسدس'' کا کمال راس ہے شعر کو، شکوہ کی زمین اقبال
جہد ناقص میں رہا مصلح خستہ کو خیال دین خالص کی وہی سرمدی دعوت ہو بحال
رب کی توفیق سے دعوت میں توانائی ہے
شاعری کی نہیں یہ روح کی رعنائی ہے

● (۲) مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد کویت آ گیا، قلم وقرطاس سے رشتہ قائم ہوا اور تقریباً اب تک عربی میں تیس کتابیں معرض وجود میں آ چکی ہیں لیکن افسوس کہ اردو میں کام کا زیادہ موقع نہ مل سکا۔

● ہمارے بزرگ بھٹی صاحب راقم کی علمی اور تحقیقی خدمت پر ''بہ صمیم قلب مبارکباد'' پیش کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''وہ عربی میں تحقیقی کام ضرور کریں، لیکن جس ملک سے ان کا اصل تعلق ہے اس ملک کے لوگوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، وہاں کے مسلمان جو ہماری اطلاع کے مطابق پچیس چھبیس کروڑ کے لگ بھگ ہیں، اردو بولتے ہیں، اردو لکھتے ہیں، ان کا اسلام سے رابطہ مضبوط رکھنے کے لئے اہل علم پر فرض ہے کہ اظہار وبیان میں اردو کو اہمیت دی جائے'' (دبستان حدیث:۶۳۳)

مولانا بھٹی صاحب کے اس ناصحانہ تبصرے نے مجھے متاثر کیا اور اردو کی طرف خود اپنی توجہ بھی مبذول ہوئی، اور میری ضروری کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے اور ہو رہے ہیں:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

● (۳) راقم کی دو قدرے معروف کتابیں ایک ''زوابع فی وجه السنة قديماً و حديثاً'' (جس میں دفاع سنت کا فریضہ انجام دیا گیا ہے) اور دوسری ''دعوة شيخ الإسلام ابن تيمية و أثرها في الحركات الإسلامية المعاصرة'' (جس میں تقریباً تمام اہم معاصر تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے) صوفیت اور کوثریت سے متعلق تحریروں پر ان حلقوں کی طرف سے تنقید بھی ہوئی ہے'' جسے میں اپنے لئے شرف سمجھ رہا ہوں:

**وإذا أتتني مذمتي من ناقص　　فهي الدلالةُ لي بأني كاملُ**

(یعنی ناقص کی طرف سے ہونے والی مذمت، جس کی مذمت کی جارہی ہو اس کے حق میں کمال کی دلیل ہے)''

● میرے اس کلام پر ہمارے بزرگ نے فرمایا:

''میرے سامنے افسوس ہے ان کی کوئی تحریر اور کوئی کتاب نہیں، اگر ان کا کوئی تحریری مواد میرے پیش نگاہ ہوتا، تو ممکن ہے میں بھی اس کے کسی پہلو پر ''تنقید'' کر کے ان کے لئے ''شرف سمجھنے'' کا اعزاز حاصل کرتا۔۔۔'' (دبستان:۶۲۹)

اس تحریر میں اشتباہ کی کوئی گنجائش نہ ہونے کے باوجود بھی میں بھٹی صاحب کے طنز ومزاح کی زد میں تو آ ہی گیا مگر:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا　　غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

● (۴) میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں کہ مولانا بھٹی صاحب کی گذارشات کے ذریعے ''تصوف اور صوفیا'' کے بارے میں ان کا موقف سمجھنے کا بھی موقع ملا اور ان کو بھی میری ''بعض تصانیف کے ناموں سے'' اشارہ ملا کہ میں اس مشرب کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ صوفیت کے ناقدین میں سے ہوں۔ فرماتے ہیں:

''دوسری گذارش یہ ہے کہ بیس پچیس برس سے ہمارے بعض اصحاب قلم نے صوفیا پر تنقید کو اپنے لئے ضروری قرار دے رکھا ہے۔ مولانا صلاح الدین کی بعض تصانیف کے ناموں سے اشارے ملتے ہیں کہ انھوں نے بھی اپنی تحقیق کے مطابق یہ فریضہ ادا فرمایا ہے۔ میں نے ان کی کتابیں نہیں پڑھیں، اس لئے مجھے معلوم نہیں کہ ان کے نزدیک ''صوفی'' کی کیا تعریف (ڈیفی نیشن) ہے''؟۔

● اس پر عرض ہے:

باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر　　عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکار چمن

اس کے بعد صوفی کی تعریف کی گئی ہے اور جماعت اہل حدیث (پنجاب) کے کوہ وقار اور تقویٰ شعار بزرگ ''حضرت سید عبداللہ غزنوی'' وغیرہ جیسے علماء فضلاء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پھر برِّ صغیر کے معروف صوفیا کا نام لے کر ''اشاعت اسلام'' جیسی خدمات وغیرہ کا اعتراف کیا گیا ہے خلاصہ یہ کہ:

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر　　ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

صوفیا پر تنقید کا ''فریضہ'' اتنا ہی پرانا ہے جتنا ان کا نام، جس کے مشتقات کا قرآن کریم، جملہ کتب حدیث اور دواوین سنت میں کہیں وجود نہیں۔ ان کے کشف و کرامات کو دیکھ کر بطور خاص برصغیر میں جو اسلام پھیلا اس کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ تقویٰ شعاری، زہد وعبادت، صبر وتوکل، پابندیٔ شریعت اور ہمدردیٔ خلائق جیسے اوصاف جمیلہ اور اخلاق جلیلہ کو صوفیوں کی میراث جتانا کہاں کا انصاف ہے؟

اور ان اوصاف سے متصف علماء وفضلاء کو صوفی ہی کا خطاب دینا کہاں کی تحقیق ہے؟

اس سلسلے میں راقم شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے موقف کا ہمنوا ہے، انھوں نے فرمایا کہ:

لا ''اگر ماحول میں ایسے لوگوں کی کثرت نہ ہوتی، اور انھیں ''سادات الأنام، مشايخ الإسلام، أهل التوحيد والتحقيق وأفضل أهل الطريق.... کا خطاب نہ دیا جاتا تو ان کے اقوال کے بطلان اور ان کی گمراہیوں کی وضاحت کی ضرورت ہی نہ پیش آتی''۔ (فتاوی:۲/۳۵۷-۳۵۸)

فاضل گرامی بھٹی صاحب کی اس گذارش کا احسان مند ہوں کہ اس سے مجھے اس موضوع پر مزید غور وفکر کا مزید موقع فراہم ہوا اور ان کے نام ایک ذاتی خط میں اپنے موقف کی وضاحت بعنوان: ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' کی۔ (اللہ تعالیٰ ان کے قبر کو نور سے بھر دے) انھوں نے میری تنقید کو اپنے نوٹ کے ساتھ ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں افادۂ عام کے لیے شائع کر دیا، یہ حق جوئی اور ہمت افزائی کی میری نظر میں ایک نادر مثال ہے۔ بعد میں یہ مضمون ''ترجمان جدید'' دہلی میں بھی شائع ہوا۔

آزادہ رو ہوں اور میرا مسلک ہے صلح کل　　ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(۵) کویت آمد پر ایک مجلس میں ہمارے بزرگ مولانا بھٹی صاحب نے ''برِّ صغیر میں اہل حدیث کی ادلیات'' پر گفتگو کی، یہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اس سے ایک طرف تو ان قد آور شخصیتوں کی اپنے مشن سے والہانہ وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے اس میں سامان عبرت ونصیحت بھی موجود ہے، کہ کن نازک اور صبر آزما حالات میں ہمارے اسلاف نے برِّ صغیر کے دینی اور سیاسی ماحول میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے پیش قدمی کی۔

راقم نے اپنے بزرگ سے اس موضوع پر تصنیف کی گذارش کی جس کی برادر گرامی شیخ محمد عارف جاوید محمدی نے پرزور تائید کی، راقم نے اسی مجلس میں یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر یہ کتاب تیار ہو جاتی ہے تو اسے عربی کا جامہ پہنانا اس کی ذمہ داری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کتاب کے مصنف گرامی مولانا بھٹی صاحب کو انھوں نے دوران تصنیف اکسیڈنٹ (وہ بھی داہنے ہاتھ کا) ہو جانے کے باوجود کتاب مکمل فرما کر اپنا وعدہ پورا کیا۔ اب راقم کی نگرانی میں مولانا راشد حسن سلفی

مبارکپوری وفقہ اللہ نے اس کا ترجمہ مکمل کر دیا ہے۔ حضرت کو اس کی خبر ان کی زندگی میں میں نے اور برادرِ گرامی شیخ عارف جاوید محمدی نے دے دی تھی۔ اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس کی طباعت کی توفیق بخشے۔

ع ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

اس گراں قدر کتاب کا انتساب فاضل گرامی مصنف کتاب نے خدمت علم وعلماء کے شوقین گرامی قدر شیخ عارف جاوید محمدی اور اس راقم کے نام کیا ہے، انتساب میں برادر بزرگوار کے ساتھ اپنا نام ریشمی لباس میں ٹاٹ کا پیوند ہی ہے، بہر حال محب گرامی مولانا بھٹی صاحب کی پسند، ورنہ:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیم صبح تیری مہربانی

میں نے اپنے شعری مجموعہ ''مسدس شاہراہ دعوت'' کا انتساب اپنے بزرگ بھٹی صاحب کے نام کیا تھا جو انھیں کے بے لاگ تبصرے کا رہین منت ہے۔ انھوں نے اس کتاب کے انتساب میں میرا نام بھی شامل کر کے دنیا میں ہی مجھ سے اپنا بدلہ لے لیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

**مولانا بھٹی کی تحریروں میں راقم کے تذکرے:**

اکابر وافاضل رفقاء واحباب تو ہمیشہ لائق التفات وقابل توجہ ہوتے ہیں لیکن مولانا بھٹی اپنے عقیدت مندوں اور خوردوں کے تذکرے اپنی تحریروں میں جس فراخ دلی سے کرتے ہیں اس کی مثال میری نظر میں اور کہیں نہیں۔ ان کی مختلف تحریروں میں راقم الحروف کے تذکرے بیس سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہیں، گویا بھٹی صاحب فرمارہے ہیں، ع قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

اس عنوان کے بارے میں آپ راقم پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل کہہ سکتے ہیں:

بہت ہوشیار ہوتا ہے، بکارِ خویش دیوانہ
ملا دیتا ہے ان کے ذکر میں اپنا بھی افسانہ

سفر کویت سے قبل وہ عمرے کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور برادر گرامی مولانا عزیر شمس سے گفتگو ہوئی، اس مجلس میں مولانا بھٹی بھی تھے آواز کافی تیز آرہی تھی تو انھوں نے بتایا کہ بھٹی صاحب بہت اونچا سنتے ہیں۔ مولانا کے انتظار میں کویت ایرپورٹ پر ہم لوگ چشم براہ تھے اب انھیں کے الفاظ میں استقبال کا حال اور راقم کا حلیہ ملاحظہ فرمائیں:

● یکم جولائی ۲۰۰۸ء کو غروب آفتاب کے بعد سات بجے جہاز سے کویت ایرپورٹ پر اترا، سلمان زیدی صاحب کے ساتھ آگے بڑھا تو عارف جاوید محمدی، مولانا عبدالخالق مدنی اور چند دیگر دوست میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھیں دیکھ کر اور مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ ایسے معلوم ہوا کہ اپنے گھر آگیا ہوں۔ ساتھ ہی چائے خانہ تھا، وہیں چائے کے لیے بیٹھ گئے، وہیں ایک صاحب اور آگئے، میانہ قد، اکہرا بدن، ستواں ناک، گندمی رنگ، عربی لباس پہنے ہوئے۔ نہایت تپاک سے ملے، معلوم ہوا کہ یہ مولانا صلاح الدین مقبول احمد ہیں۔ سب نے اکٹھی چائے پی اور باتیں کیں، اب میری سفر کی تمام کوفت دور ہو چکی تھی اور ہشاش بشاش تھا۔ (ہفت روزہ الاعتصام ۲۶ رستمبر تا ۲ راکتوبر ۲۰۰۸ء، ص:۱۹)

● ۲ رجولائی رات کو از راہ کرم مولانا صلاح الدین مقبول احمد آگئے۔ خوش اخلاق اور خوش گفتار عالم دین، بہت سی عربی کتابوں کے مصنف، وطنی تعلق ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بلرامپور کے ایک گاؤں ''اونرہوا'' سے ہے۔

اس فقیر پر انھوں نے عربی میں مضمون لکھا ہے جو مطبوعہ صورت میں مجھے دکھایا۔ مضمون کا ہر لفظ اس خاک نشین سے ان کے قلبی لگاؤ کا آئینہ دار ہے، مجلس میں مولانا ممدوح ماشاء اللہ خوب چہکتے ہیں، از راہ کرام انھوں نے مجھے عربی پوشاک بطور تحفہ عنایت فرمائی (جو دشداشہ (عربی چغہ) غترہ (سفید رومال) بنیان اور پاجامے پر مشتمل ہے)۔ میں نے دوستوں کی اس مجلس میں ان کے کہنے پر یہ پوشاک پہن کر دکھائی۔ رات کی یہ مجلس دیر تک جاری رہی، یہ ایک یادگار مجلس تھی، جس میں برصغیر کے اصحاب علم کا تذکرہ بھی ہوا بعض حضرات نے اپنے چند ذاتی واقعات بھی بیان کیے، لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلا۔ (ایضا:۲۰)

● ۳ رجولائی کے روزنامہ کویت ٹائمز میں اعلان شائع ہوا کہ نماز عشاء کے بعد قرطبہ ہال میں اہل حدیث سے متعلق میری خدمات کے سلسلے میں مجھے شیلڈ دی جائے گی۔ تلاوت قرآن مجید سے کاروائی کا آغاز ہوا، اسٹیج سیکریٹری مولانا عبدالخالق مدنی تھے۔ ابتدائی خطاب میں انھوں نے مرکز دعوۃ الجالیات (جمعیت اہل حدیث) کی دعوتی تصنیفی وتبلیغی کوششوں اور سرگرمیوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔

اس کے بعد مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے عربی زبان میں حاضرین سے راقم کا تعارف کرایا جس کا اردو ترجمہ مولانا محمد انور سلفی نے کیا۔

اب اسٹیج سیکرٹری مولانا عبدالخالق مدنی نے میرا نام لے کر اعلان کیا کہ جماعتی اعتبار سے ہمارے لیے یہ مسرت انگیز تاریخی لمحات ہیں کہ ابھی ان کی تاریخ اہل حدیث کے متعلق گراں قدر خدمات پر ''مؤرخ اہل حدیث'' کی شیلڈ پیش کی جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے جمعیت احیاء التراث الاسلامی کے سربراہ جناب شیخ طارق العیسیٰ حفظہ اللہ کو دعوت دی جنھوں نے مرکز دعوۃ الجالیات کی طرف سے مجھ خاک نشین کو ''مؤرخ اہل حدیث'' کی پروقار شیلڈ پیش کی، اس کے بعد میں نے چند الفاظ میں مرکز دعوۃ الجالیات کے معزز ارکان شیخ طارق العیسیٰ اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (اعتصام ص:۲۰۔۲۱، مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حیات و خدمات، ص:۲۲۳ مولانا محمد انور سلفی)

اجتماع میں جو شیلڈ مجھے دی گئی، اس پر مندرجہ ذیل الفاظ تحریر ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

”قال الله تعالى: وقل اعملوا فسيرى الله عملكم ورسوله والمؤمنون.“

”وقال النبی ﷺ: من لم يشكر الناس، لم يشكر الله.“

يسرّ مركز دعوة الجاليات (بالكويت) تقديم الدرع التذكارى -مؤرخ أهل الحديث - لفضيلة الشيخ محمد إسحاق بن عبدالمجيد -بهٹی حفظه الله- اعترافا وتقديرا لجهود الشيخ المشكورة. فى تأريخ أهل الحديث. فجزاه الله عنا و عن الإسلام خيرا.“

”یہ پروقار شیلڈ عالم اسلام کے عظیم صحافی ومصنف مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کو تاریخ اہل حدیث کے لیے ان کی گراں قدر خدمات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے مرکز دعوۃ الجالیات کے ماہانہ اجتماع (قرطبہ) میں مورخہ: ۲۹/۶/۱۴۲۰ھ مطابق ۳/۷/۲۰۰۸ء کو پیش کی گئی۔ من جانب: مرکز دعوۃ الجالیات (جمعیت اہل حدیث) کویت۔“ (گزر گئی گزران، ص: ۴۴۱، ۴۴۲)

بھٹی صاحب نے اس شیلڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے سفرنامے زیارت حرمین اور سفر کویت میں لکھا ہے: ”میں اپنے بارے میں ”مؤرخ اہل حدیث“ ہونے کا دعوی نہیں کرسکتا اور نہ میں کبھی اس قسم کی غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہوا ہوں۔ اپنی حد میں رہتا ہوں، البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ اپنے علم ومطالعہ کے مطابق میں جماعت اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث کی خدمت میں مشغول ہوں اور اس میں بے حد مسرت محسوس کرتا ہوں۔ میں نے اب تک اپنی کتابوں میں بے شمار مرحومین و موجودین علمائے اہل حدیث کا تذکرہ کیا ہے، کسی بزرگ کا تفصیل کے ساتھ، کسی کا اختصار کے ساتھ۔ آئندہ بھی اگر زندہ رہا اور قلم وقرطاس سے وابستگی رہی تو ان شاء اللہ یہ خدمت سرانجام دیتا رہوں گا۔ کسی کو میری تحروں کے کسی حصے سے اختلاف ہوگا، کسی کو اتفاق، میں سب کا شکر گزار ہوں۔ مجھے اپنے کام سے تعلق ہے جو اپنی معلومات کی روشنی میں کررہا ہوں۔ کوئی شخص یا گروہ اس سلسلے میں میری حوصلہ افزئی کرتا ہے اور میری خدمات کو صحیح قرار دیتا ہے تو انسانی فطرت کی بنا پر مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے اور دل میں کام کو آگے بڑھانے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ (الاعتصام: ۲۶ ستمبر تا ۲ اکتوبر ۲۰۰۸، ص: ۲۱)

● ۴ جولائی کو ارکانِ جالیات کی طرف سے اس کے مرکز میں بھی مجھے ”مؤرخ اہل حدیث“ کا ایوارڈ دیا گیا اور اس جماعت کے سلسلے میں میں نے جو خدمات سرانجام دی ہیں، پاکستان کے مولانا عارف جاوید محمدی اور ہندوستان کے مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے ان کا تذکرہ کیا۔

● ۵ جولائی کو ہفتے کا دن ہے، یہاں جمعہ اور ہفتہ کو اردو اخبار شائع نہیں ہوتا۔ نو بجے کے قریب عارف جاوید صاحب تشریف لے آئے، ان کے ساتھ میں مولانا عبدالخالق مدنی کویت کے ایک معروف مقام ”الجہرا“ کی طرف روانہ ہوئے، جہاں کویت کے اہل حدیث نوجوانوں نے ایک علمی مجلس کے انعقاد کا اہتمام کیا تھا۔ اس مجلس علمی میں راقم الحروف پر بخاری شریف کے ابتدا سے کتاب العلم کے آخر تک، ثلاثیات بخاری، کتب ستہ کے اطراف، الاربعین نبوی اور شرح نخبۃ الفکر کی قراءت کی گئی۔ اس کے بعد راقم نے تمام حاضرین مجلس کو ”أجزتكم كما أجازنى مشائخى الكرام العلامة فضيلة الشيخ المحدث الحافظ محمد الغوندلوى، والمحدث الفاضل محمد إسماعيل السلفى والمحدث الفاضل الشيخ محمد عطاء الله حنيف الفوجيانى صاحب التعليقات السلفية“ کے الفاظ کے ساتھ) سند اجازۃ الروایۃ دی۔

اس مجلس سے فراغت کے بعد ہم اپنے فاضل دوست مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔ مولانا ممدوح نہایت دلچسپ آدمی ہیں اور بہت عمدہ باتیں کرتے ہیں۔

● ۱۱ جولائی، آج جمعۃ المبارک کا دن ہے۔ کویت میں بعض مقامات پر اشتہار چسپاں کردیے گئے تھے کہ آج نماز مغرب کے بعد جمعیۃ احیاء التراث کے قرطبہ ہال میں حجیت حدیث سیمینار ہوگا۔ قرطبہ ہال کویت کا بہت بڑا ہال ہے جو حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ ہال کے باہر دور تک گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے بے شمار لوگ موجود تھے۔ بنگلہ دیش کے لوگ بھی تھے۔ مولانا عبدالخالق مدنی نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض ادا کیے تھے۔ تلاوت قرآن پہلے عارف جاوید صاحب کے فرزند عزیزی محمد شفیع عارف نے کی۔ بعد ازاں پروگرام کے مطابق حافظ ابوبکر عتیق نے ”حفاظت حدیث“ کے موضوع پر تقریر کی۔

بعد ازاں ”حجیت حدیث“ کے موضوع پر مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے خطاب فرمایا۔ مولانا ممدوح بہت سی کتابوں کے مصنف اور معروف مفسر ہیں۔

ان کے بعد میں نے اپنی گزارشات پیش کیں، میرا موضوع تھا ”علمائے برصغیر کی خدمات حدیث“، اس موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس سے پہلے مولانا عبدالخالق نے حاضرین سے میرا تعارف کرایا۔ انھوں نے جن الفاظ میں میرا تعارف کرایا اور جس انداز سے کرایا، اس کا ذکر کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ جب وہ اپنے اسلوب خاص سے میرے ”علم وفضل“ کی وضاحت فرمارہے تھے، اس وقت اس کے بوجھ سے میری گردن جھکی ہوئی تھی۔

● ۱۲ جولائی، آج دس بجے کے قریب لجنۃ القارۃ الہندیۃ کے دفتر گئے، یہاں متعدد حضرات سے ملاقات ہوئی، جن میں عرب علما بھی تھے اور ہندوستانی اور پاکستانی حضرات بھی۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا انواع واقسام کا پرتکلف کھانا۔

وہاں پتا چلا کہ آج ایک عربی رسالے ”امتی“ میں میرے متعلق مولانا صلاح الدین مقبول احمد صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے۔ مولانا ممدوح کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ وہ بہت سالوں سے یہاں مقیم ہیں اور اس نواح کے اہل علم میں انھیں

بڑے اعزاز کا مقام حاصل ہے۔ بہت سے عرب اصحاب علم ان کے دائرۂ شاگردی میں شامل ہیں۔ اللہ تعالی انھیں خوش رکھے، نہایت خوش اخلاق اور ہم دردِ عالم دین ہیں۔ میں نے ان کے حالاتِ زندگی اپنی کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں۔

● ۱۴؍جولائی بروز سوموار، یہ کویت میں میرے قیام کی آخری تاریخ اور آخری دن ہے۔ میں عمر کی جس منزل میں ہوں اس کے پیش نظر آئندہ اس نواح میں جانے، ان حضرات سے یک جا ملنے اور اتنا لمبا سفر کرنے کی بہ ظاہر کوئی امید نہیں، آج دس بجے کے قریب مولانا عارف جاوید محمدی، مولانا محمد بشیر طیب، حافظ ابوبکر عتیق، مولانا ابوسفیان بن مولانا محمد بشیر طیب، مولانا صلاح الدین مقبول احمد اور بعض دیگر دوست تشریف لائے، مولانا عبدالخالق مدنی پہلے سے موجود تھے۔

اب آئندہ سطور میں مولانا محمد بشیر طیب (رحمہ اللہ) کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں مرکز توعیۃ الجالیات کویت کے معزز ارکان کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے۔

● ''مولانا صلاح الدین مقبول احمد: ان کا وطنی تعلق ضلع بلرامپور (یوپی، ہندوستان) کے ایک قصبے سے ہے۔ مدینہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں کویت کی وزارت اوقاف والشئون الاسلامیہ کی طرف سے خطابت و امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ۱۹۹۰ء کی عراق کویت جنگ کے بعد سے جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کے مفتی اور محقق کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ قابل اور تجربہ کار استاذ ہیں، بہت سے عرب علمائے کرام جو کویت میں خطابت وامامت اور تدریس میں مصروف ہیں ان کے دائرۂ شاگردی میں رہے ہیں اور ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

مولانا ممدوح کو مرکز دعوۃ الجالیات کے سرپرست کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے واقعات حیات میں نے اپنی کتاب دبستانِ حدیث'' میں تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ گزشتہ سطور میں بھی ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔

● کویت سے ایک ماہنامہ رسالہ ''امتی'' (Ommaty) عربی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں اس فقیر کے بارے میں مولانا صلاح الدین مقبول احمد نے مضمون سپرد قلم کیا۔ اس مضمون کا عنوان ہے: ''من أعلام العصر الحاضر: فضيلة الأستاذ محمد إسحاق بهٹی- مؤرخ القارة الهندية الباكستانية الشهير.''

فاضل مضمون نگار کا وطنی تعلق ہندوستان سے ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں میری حقیر سی تصنیفی خدمات کا خاصی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور میرے حالات بیان کیے ہیں۔ میں اس پر ان کا نہایت شکر گزار ہوں۔ (گزر گئی گزران ص:۴۳۴)

● مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''مولانا ممدوح کی بعض کتابوں کا بعض ہندوستانی اصحاب علم نے عربی ترجمہ بھی کر دیا ہے۔ ترجمہ کرنے والوں میں ہمارے دوست مولانا صلاح الدین مقبول احمد (کویت) کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ (گزر گئی گزران، ص:۷۹)

● ''دبستان حدیث'' میں اس راقم کا ایک مختصر خاکہ (۶۲۳-۶۳۴)۔

● مسدس شاہراہِ دعوت (حرفے چند)۔ (یعنی راقم کی کتاب پر مقدمہ)

● برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات (ص:۵، انتساب، وص:۱۶۹، راقم کا تذکرہ)

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ کتنی شخصیات کو گوشۂ گمنای سے نکال کر لوگوں سے روشناس کرایا اور جس فراخ دلی سے ان کے تراجم لکھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی لیے میں نے بھٹی صاحب کے بارے میں طوالت سے کام لیا ہے ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم''

میں نے عربی میں بھی ان پر مضمون لکھا تھا جو ان کی زندگی میں عالم عرب اور بر صغیر کے کئی عربی مجلّات میں شائع ہوا اور وفات کے بعد بھی۔ اسی طرح پچاس اشعار سے زائد پر مشتمل قصیدہ بھی لکھا ہے جو شامل اشاعت ہے، اسی قصیدے کا ایک شعر مجلّہ ''نوید ضیاء'' (مولانا محمد اسحاق بھٹی نمبر) کے ٹائٹل پیج پر مذکور ہے۔ اس میں بطور خاص میں نے بھٹی صاحب کی اہم تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے فن کو دادِ تحسین دی ہے۔

● مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ اپنی زندگی کی تقریباً (۹۳) بہاریں دیکھ کر اس دارِ فانی سے (۲۰۱۵/۱۲/۲۳ء بروز منگل دو بجے رات کو) رخصت ہو گئے، انھوں نے اپنے دور کے مختلف میدانہائے عمل کے ماہرین سے استفادہ کیا، مشہور جرائد ومجلّات کی سالہا سال ادارت کی، قرنِ اول سے لے کر عصرِ حاضر کی ہزاروں شخصیات کے تراجم لکھے، مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں، مفید کتابوں کے ترجمے کیے اور بہت سی کتابوں کی تحقیق کی، تحریر وصحافت اور تصنیف وتحقیق میں بھرپور زندگی گذاری اور اپنی حیات مستعار کے لمحات کو اس کارِ عظیم کے لیے وقف کر دیا، جس کا اعتراف بر صغیر کے اہل قلم نے خود ان کی زندگی میں کیا، ان پر ان کے معاصرین نے مضامین لکھ کر انھیں دادِ تحسین دی، منتہی طلبہ نے یونیورسٹیوں میں ان کی شخصیت پر ایم اے اور پی ایچ دی کی ڈگریاں حاصل کیں اب وہ ہم میں نہیں لیکن ان کی یادوں سے خانۂ دل آباد ہے اور ان کی تحریروں نے انھیں زندہ وجاوید بنا دیا ہے۔

زندگی بخشی ہزاروں علم کے آفاق کو
موت نے چھوڑا نہیں پر حضرتِ اسحاق کو

ان کی آپ بیتی ''گزر گئی گزران'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اب ایسے خلوص کیشوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے؟

اللہ تعالی ان کی خدمات کو قبول فرمائے، خطاؤں سے درگذر کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے!

يرحم الله عبداً قال :آمينا!

# مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ اور معاصر تذکرہ نگاری

شیخ عبدالمعید مدنی (علی گڑھ)

مولانا بھٹی کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا کی اور ان کو تحریری کاموں کی توفیق دی۔ انہوں نے زندگی کی نوے بہاریں دیکھیں۔ چند سال قبل ان کی وفا شعار سمجھدار اور سلیقہ مند بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ نرینہ اولاد کوئی نہ تھی صرف بچیاں تھیں۔ ان کی شادی بہت پہلے ہوچکی تھی۔ تنہا تھے بھائی اور بھتیجوں کے درمیان خوش وخرم تھے۔ ان کو بھی اولاد ہی کی طرح پالا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اچھی صحت عطا کی تھی اس عمر میں بھی انھیں کوئی بیماری نہ تھی۔ انتقال سے دو دن قبل تک ان کا قلم چلتا رہا۔ وقت موعود آپہنچا۔ معمولی بخار اور نزلہ زکام ہوا۔ فریش بنے، بغیر کسی پریشانی کے صاف ستھرے اللہ کو پیارے ہوگئے۔

۲۲ دسمبر ۲۰۱۵ء ۸ بجے ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب کاس گنج نے خبر دی کہ مولانا بھٹی وفات پاگئے۔ اسی دن دو گھنٹہ بعد یہ خبر بھی آئی کہ مولانا عبداللہ مدنی بھی جوار رحمت میں پہنچ گئے۔ ایک ہی دن دو حادثے۔ سارے احباب ومتعلقین میں ساری دنیا میں آناً فاناً یہ خبر پھیل گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا بھٹی نے خود اپنی ذاتی بایوگرافی لکھی ہے (گذر گئی گذران) اور تذکرے کی اکثر بیشتر کتابوں میں خود ان کا تذکرہ موجود ہے۔ ان پر لکھیں بھی تو کیا لکھیں۔

جامعہ رحمانیہ بنارس میں ۱۹۶۹ء میں داخلہ ملا وہاں طلباء کی لائبریری میں الاعتصام کی فائلیں دستیاب تھیں۔ اسی وقت سے مولانا بھٹی سے اور ان کی تحریروں سے تعارف رہا اور اسی وقت سے برابر ان کی علمی وصحافتی کاموں سے بطور قاری ربط برقرار رہا۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے رٹائرمنٹ کے بعد سے لے کر انتقال فرمانے تک کوئی بیس سالوں میں ان کے علمی فنی اور تذکرہ جاتی انتاجات قابل رشک ہیں۔ مولانا کی علمی یکسوئی، استحضار اور استقلال مثالی ہے۔ انہوں نے جب سے قلم تھاما رکے نہیں۔ انہوں نے ۶۷ سالوں تک مسلسل قلم چلایا اور ہر سال ایک ہزار صفحات کے اوسط سے لکھا۔ اس طرح کا علمی انہماک کم کسی کو میسر ہوتا ہے۔ وہ ریڈیو، ٹیلیویژن اور اخباروں میں مسلسل نظر آئے، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی۔ یونیورسٹیوں کے وایوا میں بلائے گئے۔ یونیورسٹی کے طلباء کے مقالات کو درست کیا انھیں گائڈ کیا۔ علمی مجلّات وجرائد میں زمانے تک لکھا۔ مختلف میگزینوں کے ایڈیٹر بنے، موسوعاتی کام کئے اور موسوعاتی منصوبوں میں حصہ لیا۔

مولانا بھٹی صاحب قلم تھے اور طویل مدت تک قرطاس وقلم سے ان کی رفاقت تھی اور اردو دنیا کے وسیع پلیٹ فارم پر کام کیا اس لئے ان کا حلقہ احباب اور حلقہ تعارف بہت وسیع تھا۔ ہر طبقے کے لوگوں سے خوشگوار تعلق رکھنے میں انھیں مہارت تھی۔ پوری اردو دنیا میں ان کی علمی شخصیت مسلم تھی۔

پورے برصغیر میں ان سے زیادہ شخصیات اور تذکرے پر کسی نے لکھا ہی نہیں۔ اصالۃ اور ضمناً انہوں نے ہزاروں لوگوں پر لکھا۔ بھٹی مرحوم شاہد عصر تھے۔ ان کے مشاہدے کی قوت بھی زور دار تھی۔ ان کے تذکرے بہت سے علماء اور رجال کار سیاست کاروں، سماجی کارکنوں، تجار اور ماہرین فن کو خمول سے روشنی میں لانے کا سبب بنے اور ان کو متعارف کرایا۔ انہوں نے بہت سی جماعتوں، احزاب اور پارٹیوں کو اپنی کتابوں میں اجالا بخشا، بہت سے گاؤں قصبوں خاندانوں گھروں اور اداروں کو گم نامی کی تاریکی سے نکالا۔ بہت سی گلیوں سڑکوں کے ناموں سے لوگوں کے کان آشنا ہوئے بہت سی کتابوں کے ناموں سے لوگ آگاہ ہوئے۔ بہت سے دینی مجلّات وجرائد سے لوگ باخبر ہوئے۔ دین، سیاست، رجال، علم وفن، تذکرہ (سوانح) پر انہوں نے بکثرت لکھا اور جو لکھا اس میں مقصدیت بھی تھی، منہجیت بھی تھی اور اس کے بڑے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ مولانا کی تحریریں اتنی وسیع اور متنوع ہیں کہ ان سے برصغیر کی سو سالہ سیاسی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی صحافتی تاریخ لکھی جاسکتی، اور خاص کر ان کی تحریریں ہندوستان میں (تاریخ اہل حدیث) کی تصنیف کے لئے رومٹیریل ہیں۔ وہ ایک شاندار تاریخ کی تدوین میں اساسی رول پلے کرسکتی ہیں۔ رجال وسیر اور تذکرے پر انہوں نے تنہا اتنا لکھ دیا ہے کہ بعض تصنیفی ادارے اتنا نہیں لکھ اور چھاپ سکے۔ ان کی تفصیلات کئی کتابوں میں موجود ہیں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کی کتب تراجم کے متعلق میں نے دس سال قبل ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جو ترجمان دہلی اور الاعتصام لاہور میں چھپ چکا ہے اور مولانا بھٹی سے متعلق مرتب کردہ ایک کتاب میں بھی آگیا ہے۔

اردو میں تذکرہ نگاری کو مولانا بھٹی نے کافی رچ کیا ہے اور نیا انداز واسلوب دینے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی تذکرہ نگاری میں ندوہ اور دار المصنفین کا نام لیا جاتا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ندوۃ کی تذکرہ نگاری علی میاں کے حوالے سے ایک غیر سنجیدہ عمل ہے۔ کھوکھلے الفاظ کی چونا کاری، مدلل مداحی اور اعلام واشخاص پر پسندیدہ رنگ چڑھانے کی ناکام کوشش۔ اور تاثراتی رنگ آمیزی کی ناپسندیدہ حرکت۔ علی میاں کی اصل پہچان تذکرہ نگاری ہے لیکن ان کی تذکرہ نگاری میں پسندیدہ شخص کو ہیرو بنانا اور ناپسندیدہ شخص کے متعلق لیپا پوتی کرکے اس کی حیثیت

زاہدانہ اسلوب میں غیر معتبر ٹھہرانا ہی سب کچھ ہے۔ یہ ان کے گھرانے کا پیشہ ہے۔ یہی کام ان کے ابا جان نے نزہۃ الخواطر میں کیا ہے۔ جس کی ایک جھلک میں نے ''نزہۃ الخواطر'' کے ناپسندیدہ طرز کو ۸ر قسطوں کے ایک مضمون میں عیاں کرنے کی کوشش کی ہے، جو ترجمان ہندوستان اور اہل حدیث لاہور میں چھپ چکا ہے اور سید عبدالحئی حسنی صاحب ''نزہۃ الخواطر'' کے (دلی اور اس کے اطراف) کے سفرنامہ میں میاں صاحب (سید نذیر حسین) کے متعلق تحقیق آمیز تبصروں کے دو جائزوں میں دکھلایا ہے۔ علی میاں کی تذکرہ نگاری کی سب سے بڑی پہچان لیپ پوت ہے، جس کا مقصد ہوتا ہے حقائق کو مشکوک بنانا اور افسانوں کو حقیقت بنانا اور بین السطور خود کو مصلح، قابل اور سمجھدار ثابت کرنا۔ یہ ان کی تذکرہ نگاری کا چور دروازہ ہے جس سے داخل ہو کر وہ سچائیوں کو تہس نہس کرتے ہیں۔ زمین پر موجود حقائق کو مٹی بناتے ہیں اور مٹی سے متوہم شخصیات کا عظیم پیکر تراشتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں تذکرہ نگاری کا یہ مفہوم کبھی نہیں رہا۔ تذکرہ نگاری دراصل شہادت حق کی ذمہ داری نبھانے کا نام ہے۔ کسی کی عظمت کا پہاڑ کھڑا کرنے کا نام نہیں ہے نہ مدلل مداحی کا نام ہے نہ ساری فکری کجیوں کو خوبصورت بنانے کا نام ہے۔

علی میاں کی تذکرہ نگاری کی ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اشخاص واعلام کو ایسا دکھلاتے ہیں جیسے وہ فرشتے ہیں اور اخطاء وفکری کجی پر بھی تبریری اسلوب اختیار کر کے عیب کو ہنر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فکری کجی کے عیب کو ہنر بنانا ان کا سب سے اہم مشغلہ ہے۔ ٹھیک ہے شخصیات کو اچھا برا کہنا غلط ہے اور ان پر بلا ضرورت رفض وقبول کا حکم لگانا تذکرہ نگار کا کام نہیں۔ اسے مفتی بننے کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس کی ذمہ داری میں یہ چیز داخل ہے کہ تذکرہ نگاری میں خصوصاً اعلام کی تذکرہ نگاری ہو تو بلا کم وکاست ان کے انتاجات کو بیان کرنا چاہیے، کیوں کہ اعلام امت کے سرمایہ ہیں، کسی کی ذاتی چیز نہیں ہیں۔ اور ان کی فکر اور انتاجات میں کسی طرح کی کمی ہے تو اسے نمایاں کرنا ضروری ہے، اگر ان کے کسی غلط عمل سے مسلم سماج اور فرد پر غلط اثرات پڑ رہے ہیں تو اسے بھی نمایاں کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان ایسا نہ کر سکے تو تذکرہ نگاری کا کام کیوں کرے، افسانہ نگاری کرے؟ علی میاں کے سارے تذکروں میں تبربری اسلوب کی لیپ پوت ہر جگہ نظر آئے گی اس طرح کی کل تذکرہ نگاری عیب وہنر کو خلط ملط کرنے کی ایک ناروا کوشش ہے۔

علی میاں کی تذکرہ نگاری میں ایک تیسرا سب سے بڑا عیب ہے جو ان کی کل تذکرہ نگاری کی تحریروں کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ وہ تذکرہ نگاری کو پرسنلائز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاروان زندگی، سیرت سید احمد شہید، پرانے چراغ، حیات عبدالحئی سید احمد شہید شاہ اور دیوبندی علماء کے متعلق ان کی اور ان کے گھرانے کی کل تحریروں پر پرسنلائزیشن کی گہری چھاپ ہے۔ اور پرسنلائزیشن کا عمل کلی طور پر پر حب جاہ اور شہرت پسندی سے جڑا ہوتا ہے۔

علی میاں کی تذکرہ نگاری پر پرسنلائزیشن کی چھاپ دو طرح سے آتی ہے۔ ایک تو خود ان کی اپنی اور اپنے خاندان کی حیثیت بڑھانے کی ناروا کوشش۔ اور دوسرے تذکرہ نگاری سے متعلق تمام تحریروں کو تصوف کے رنگ میں رنگنے کی ناروا کوشش حتی کہ انہوں نے تاریخ دعوت وعزیمت اول ودوم میں حضرت حسن بصری سے لے کر شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے رفقاء وتلامذہ تک پر تصوف کا گاڑھا رنگ چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ امام احمد امام اہل سنت اور شیخ الاسلام کی ہمہ جہتی تجدید مساعی دین، تجدید علوم دین اور منہج سلف کے عظیم کاموں کو ٹھگنا بنا دیا ہے اور کل عالم اسلام کو سیاسی فقہی اعتقادی عملی ہر اعتبار سے قرون مشہود لہا بالخیر کے طریقے پر لانے کی ان کی کوششوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔

اور وہ لوگ جو تصوف کی تمام کجیوں کے پاسدار تھے حتی کہ اکثر وہ معروف صوفیا جن پر علی میاں نے لکھا وحدت الوجود کے قائل تھے، اس کے مبلغ تھے اور زندگی بھر اس کو اہم کارنامہ بنائے ہوئے تھے۔ علی میاں نے ان کے فکری نقائص اور عقیدے کی خرابیوں کو تبریری اسلوب کے ذریعہ بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ تذکرہ نگاری میں ان کی ایک کمی یہ بھی ہے اور کچھ حد تک اب کے اباحیان کی بھی وہ اپنی پسند وناپسند کے مطابق شخصیات کے ایک ایک رجحان بنا لیتے ہیں، ان پر ترجیح اور رجحان کا عمل جاری رکھتے ہیں اور حقیقت کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ علی میاں کی تذکرہ نگاری میں (احادیث القصاص) کا پتہ بھی ملتا ہے۔ ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے صرف اشاروں میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں لیکن جن کی نظر حقائق پر ہے اور انہوں نے گہرائی سے ان کے تذکروں کا مطالعہ کیا ہے انھیں مجھ سے اتفاق ہوگا ان کے ابا جان کا بھی یہی طریقہ تھا۔ انہوں نے بھی زیادہ سے زیادہ نزہۃ الخواطر میں پرسنلائزیشن کا عمل روا رکھا ہے، اپنی ناپسندیدگی کے مطابق اعلام کے متعلق ہمز ولمز سے کام لیا ہے اور اپنی پسند کے مطابق اعلام سے متعلق تبریر کا رویہ اپنایا ہے، البتہ مولانا علی میاں مولانا عبدالحئی کے مقابلے میں ہمز ولمز کے بجائے لیپ پوت کا مستقل رویہ اپنائے رہتے ہیں۔

علی میاں خالص نظریاتی انسان تھے، وہ عملی انسان تھے ہی نہیں، لیکن کاروان حیات (سات اجزاء) میں آزادی کے بعد بلکہ آزادی سے کچھ پہلے امت اسلامیہ ہند کے اصلاح وبہبود کا سارا عملی کریڈٹ انھیں کو جاتا ہے۔ یہ ایک غیر مستند اور ثقاہت سے خالی دعوی داری ہے، کل مادی اسباب میسر یعنی ساری تقریریں اور تحریریں چھپ جاتی تھیں، تحریروں کی کثرت اور پھیلاؤ اور شہرت نے ان کو ضرور سارے برصغیر میں متعارف کرا دیا تھا، لیکن اصلا ان کی ساری تحریریں کٹ پیسٹ کے دائرے میں آتی ہیں۔ کبھی ان کی تحریروں میں ایسی جان اور طاقت نہیں تھی کہ ان

سے انسان کی ذہن سازی ہو سکے۔ ان کی تحریریں وقتی طور پر جذبات سے کھیل سکتی تھیں اور بس اس کے سوا وہ اپنے مخصوص ندوی حلقے سے باہر کبھی معترف نہ رہے حتی کہ وہ دیوبندی حلقہ جس کی وہ زندگی بھر اپنی تذکرہ نگاری سے خدمت کرتے رہے اور شجر دیوبندیت میں پانی اور کھاد ڈالتے رہے اس کے یہاں بھی معترف نہ تھے۔ کاروان زندگی مجھے تو پرسونا فوبیا (Persona Phobia) معلوم ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اسے (عظمت کا ہمالیہ) کہہ لیجئے۔

علی میاں کی کل تحریروں میں ایک شئے مشترک یہ ہے کہ دوسروں کے افکار نقاط اور تحقیقات کو اپنے الفاظ میں اس درجے کمال سے جذب کر لیتے ہیں کہ وہ ان کی چیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ الفاظ وزبان پر قدرت کا یہی کھیل وہ زندگی بھر کھیلتے رہے۔ خاص کر تقریروں میں اور ۸۰ر فیصد تقریریں ہی تحریری شکل میں آئی ہیں۔ لیکن مانگے کا اجالا ان کا ساتھ کہاں تک دے سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے ترجمہ اقتباس سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہے۔ اور سطحیت ان کی تحریروں کا حصہ بن کر رہ گئی ہے، جب تک وہ باحیات رہے جلوہ قائم تھا۔ آنکھ موندتے ہی سارے جلوے ماند پڑ گئے اور ان کی کتابیں مرجع کی چیز نہ بن سکیں۔

دیوبندی تذکرہ نگاری تو کل کا کل گپ ہے اور جس کو جتنا بڑا مانا جاتا ہے اس کے متعلق افسانوں کی تہیں دبیز تر ہو جاتی ہیں، ان کو قابل اعتناء بنانا ہی فضول ہے، یا یوں کہہ لیں وہ سب مقدس لوگوں کے تقدس نامے ہیں، یا پھر یہ کہہ لیں کہ کراما کاتبین کے اپوزیشن کی تحریریں ہیں۔

دارالمصنفین کی تذکرہ نگاری اور سیر وسوانح کا ایک مزاج سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے بنایا، وہ تو فقط نقول واقتباس ہیں، وہ کہیں سیکولر راستے پر چلتے ہیں، کہیں تصوف کی راہ اپناتے ہیں، کہیں قلم ملوک وامراء کا درباری بن جاتا ہے، کہیں شعراء کی مدح خوانی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے علم ومنہج کا کوئی رنگ ہی نظر نہیں آتا۔

دارالمصنفین میں تذکرہ نگاری کا ایک رنگ مولانا عبدالسلام ندوی کا تھا اور اسے بعد میں مولانا ضیاء الدین ندوی اصلاحی نے نبھانے کی کوشش کی۔ ان کا انداز واسلوب معتبر ہے مگر بہت رواروی کا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی سید الطائفہ تھے لیکن ''تھانہ بھون'' نے ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا اور قریب قریب ۱۹۳۶ء کے بعد ان کا سارا تحقیقی ذوق بگڑ کر رہ گیا تھا اور ان کی علمی کارکردگی بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک دارالمصنفین میں ان کی علمی کارکردگی پورے برصغیر میں تسلیم شدہ تھی، دارالمصنفین میں مولانا مسعود علی ندوی کے اہتمام نے اتنا زور پکڑا کہ ادارے میں ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اس ماحول نے ان کے اندر اتنا زبردست بحران پیدا کیا کہ انہوں نے تھانہ بھون کا رخ کر لیا اور تصوف کی چوکھٹ پر تحقیق کو قربان کر دیا، کچھ سالوں بعد انہوں نے بھوپال کا رخ کیا اور تقسیم ہند تک وہیں رہے۔ بھوپال کی ریاست ختم ہو گئی، دیسنہ (بہار) میں گھر فسادیوں نے جلا کر خاکستر کر دیا، نہ بھوپال میں ٹھکانا، نہ بہار میں، دارالمصنفین کے مالک ومختار بنے ذمہ دار نے لب سی لیئے۔ طوعاً وکرہاً وہ ایک ڈیلیگیشن کے ساتھ پاکستان چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور مسکنت ومظلومیت کی زندگی گذار کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یوں سید الطائفہ کے بیس سال ان کی پسندیدہ علمی دنیا سے کٹ کر برباد ہو گئے۔ باوجود وہ اپنی شاہکار تصنیف (حیات شبلی) میں مدلل مداحی سے وہ باہر نہ نکل سکے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کا منہج تصنیف وتحقیق ۱۹۳۶ء تک برصغیر میں شاہکار منہج تھا ان کے اندر تذکرہ نگاری ہی نہیں دراستہ وتحقیق کے سارے کاموں میں معیاری اور مثبت رنگ تھا لیکن بعد میں فساد خلق نے ان کو کھا لیا۔

شبلی کی تذکرہ نگاری کے بڑے ہنگامے ہیں اور بے شک وہ ہیں اس قابل۔ اسلوب نگارش سب سے اچھوتا، تحقیق بھی داد کی۔ مستحق حسن ترتیب ممتاز۔ لیکن استشراق سے تاثر نے ان کو اس کے منہج کو اپنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ علی گڈھ میں تدریس کے دوران وہ کٹر مقلد سے تجدد پسندی کی طرف آئے تھے، نعمانیت کی تنگ نائے سے نکلے اور فکر امت ان کے دامن گیر ہو گئی۔ فکر دین وامت جس قدر بڑھتی گئی علی گڈھ کی تجدد پسندی سے ان کی بے زاری بڑھتی گئی، لیکن استشراق نے جو تعقل پسندی انھیں دی تھی کلیتاً اس سے باہر نہ آسکے۔ استشراق کل کا کل دین وملت کے خلاف ایک سازش ہے، ذرہ برابر اس کی حمایت درست نہیں۔ ادب، تاریخ اور تذکرہ نگاری ان کا موضوع تھا۔ سیرۃ النعمان ان کی نعمانیت کے دور کی چیز تھی اس لئے اصولوں سے انحراف طے تھا۔ سیرۃ النعمان سے لے کر سیرۃ النبی تک انہوں نے استشراق کے پانچ اصولوں سے دامن نہ چھڑایا، ان سے کسی نہ کسی طرح تاثر برقرار رکھا۔ وہ پانچ یہ ہیں۔ (۱) اصول فطرت (۲) عادت (۳) اصول درایت (عقل وقیاس) (۴) سماجی انسیت درجحان (۵) اصول منفعت۔

ان کے تذکروں کے مقدمے پڑھ جایئے استشراق کا منہج ضرور نظر آئے گا اور تحریروں میں تحقیق، تجزیئے اور استنتاج پر ان کے اثرات ضرور نظر آئیں گے۔ سیرۃ النبی کو چھوڑ کر دیگر تذکروں میں ان کے لہجے کی شوخی استشراق کے زیر اثر نظر آئے گی۔ (الفاروق) پر ایک مرتبہ سیمینار میں مقالہ پڑھنے کے لئے دعوت ملی، غور سے مطالعہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ بے شک یہ شبلی کی شاہکار کتاب ہے، لیکن کتاب میں لہجے کی شوخی اور درجنوں مسائل میں استشراق کا پورا اثر نظر آیا اور مقدمے میں استشراقی اصول بھی جھلکتے نظر آئے۔ عنوان تھا (الفاروق کا منہجی مطالعہ) حاصل مطالعہ میں نے کھل کر پیش کیا تو ایسے لگا جیسے ہم نے بھڑ کے چھتے پر پتھر مار دیا۔ سارے کے سارے شبلی پرست لال پیلے ہو گئے اور مقالہ بھی سیمینار

کے مجموعے میں نہیں چھپا۔ میٹریل تیار تھا کہ تفصیل سے الفاروق پر لکھوں گا لیکن بحرانی دور تھا لکھ نہ سکا اور میٹریل بھی ضائع ہو گیا۔

مجھے لگتا ہے ادبی حلقوں میں تمام تر بدعنوانیوں اور عدم توازن کے باوجود تذکرہ نگاری کا عمل بحیثیت مجموعی بہتر ہے۔ وہاں کچھ تو ہے کہ تبریزی اور لیپ پوت کے ماحول میں بے لاگ تحریریں بھی ہیں۔ وہاں آخری حد تک جتھا بندی ہے اور مفادات کے حلقے ہیں، اس لئے کھینچا تانی میں باتیں چھن کر بھی آجاتی ہیں۔ اور بات یہ بھی ہے کہ ادبی حلقے کو حکومت کی نوع بہ نوع سرپرستی حاصل رہتی ہے اس لئے وہاں کام کے زیادہ چانس ہوتے ہیں اور زیادہ وسیع پیمانے پر متنوع فکر وخیال اور صلاحیت کے لوگ فکر ونظر اور تحقیق جستجو کے کاموں میں لگتے ہیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو شعبے اور تصنیف وتحقیق کی سہولیت، اکیڈمیاں اور ادبی ادارے قائم ہیں۔ ان سب کے نتیجے میں تذکرے اور سوانح عمریاں اچھے معیار کی بھی آجاتی ہیں۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی کے تذکروں کا اگر ان تذکروں اور تذکرہ نگاروں سے موازنہ کیا جائے تو بہت سی چیزیں قدر مشترک نظر آئیں گی اور بہت سے امور میں تفاوت نظر آئے گا۔

مولانا کی تذکرہ نگاری خاص کر علماء اہل حدیث اور وجہاء اہل حدیث کے متعلق ہے۔ اس وقت رجال حدیث، رواۃ اور اسناد پر لکھنے کی ضرورت تدوین علوم کے بعد پہلے جیسے نہیں رہی لیکن اب بھی اعلام ورجال کی حیات اور کارناموں کا ریکارڈ ضروری ہے، تاکہ کاروان علم وتہذیب چلتا رہے، اس کا تسلسل سلف کے ساتھ لگا رہے اور امت بانجھ نہ بنے حق وباطل عیاں رہے۔ فکر ونظر کی مشعلیں جلتی رہیں۔ رجال کار تیار ہوتے رہیں۔ حق وباطل کے درمیان امتیاز برقرار رہے۔ سب کچھ گپ نہ بن جائے یا سب کچھ ناپید نہ ہو جائے، مولانا بھٹی کی تذکرہ نگاری سے کاروان سلف لوگوں کو نظر آیا۔ اہل حدیثوں نے جانا اور دنیا نے بھی کہ کتاب وسنت کے محافظ اور دعوت حق کے دعاۃ اور منہج حق کے نمائندوں نے سرزمین ہند پر کتنا کام کیا ہے، ان کی کتنی عظیم قربانیاں رہی ہیں، کیسے کیسے اعلام وعظام نے فروغ دین وملت کے لیے قربانیاں دیں، اپنی مخلصانہ کوششوں کے نقوش انہوں نے کن کن شکلوں میں اور کہاں کہاں چھوڑے ہیں اور ان کے نقوش پر چلنے والوں کو ان سے کتنا حوصلہ اور روشنی مل سکتی ہے۔ کارگاہ حیات میں عملی نمونوں اور قدوہ کے بغیر انسانی اعمال وتجارب کے بغیر خالی خاکوں میں انسان رنگ نہیں بھر سکتا ہے، ہر مسلمان اپنے اعمال وفرائض کی بجا آوری کا ذمہ دار ہے اور جواب وہ بھی ہے یہی مستند اعمال وانتاجات ملت کی بقا اور ارتقا کے ضامن بنتے ہیں۔

مولانا نے اپنی تذکرہ نگاری کے ذریعہ ان معنویات اور محسوسات کو برصغیر کے اہل حدیثوں کے لئے خاص کر نکھارا ہے، برصغیر میں اہل حدیث علم وثقافت اور تہذیب کو گہرائی گیرائی عطا کی ہے، انھیں توانائی بخشی ہے۔ مولانا بھٹی نے اپنی تذکرہ نگاری کے ذریعہ برصغیر کے اہل حدیثوں کے کاروان علم وثقافت اور تہذیب کے بہت بڑے خلا کو پر کیا ہے، بلکہ مذکورہ ناحیوں سے انھیں امتیازی درجے میں رکھ دیا ہے۔ برصغیر کی جماعت اہل حدیث پر مولانا کا احسان ہے۔

تذکرہ نگاری کی معنویت ومقصدیت کو خاص کر اہل حدیثوں کے لئے مولانا نے پورا کر دیا ہے اور وقت کے ساتھ ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے راستہ بھی کھول دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جعلی لوگ فریب کارانہ انداز سے تذکرہ نگار بنیں اور قلم کو گھسیٹا بنا کر ادھر ادھر سے کھینچ کھانچ کر تذکرہ نگار بن جائیں جبکہ خود تذکرہ نگاری کی صلاحیت سے کلیتاً عاری ہوں۔ ایسے لوگ تذکرہ نگاری کی دنیا کے طفیلی کیڑے ہوتے ہیں، علمی، ادبی اور فنی استناد اور ثقاہت کو نقصان پہنچانے کے لئے۔

مولانا بھٹی نے اپنی تذکرہ نگاری میں خاکہ نگاری بھی کی اور ادبی فن کاری بھی کی ہے، روش عام جو صحیح نہ ہو اس پر نقد بھی کیا ہے، افکار واعمال کو جانچا پرکھا بھی ہے، اعلام ورجال کے تعلق سے مشاہدات وتجربات کو بھی رقم کیا ہے، اثرات وموثرات نتائج وعواقب کو بھی بیان کیا ہے اور رجال کی علمی تصویر ایسی کھینچی ہے کہ وہ چلتے پھرتے دکھنے لگیں۔ انہوں نے رجال واعلام کو پرسنلائز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ نہ عود ولوبان اور اگربتی جلا کر ان کے مقبروں پر مجاوری کرنے بیٹھ گئے ہیں۔ انہوں نے انھیں اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسا انھیں دیکھا ہے انہوں نے اعلام کو مقدس بنا کر نہ تقدیس نامہ مرتب کیا ہے اور نہ کسی کو کالعدم بنانے کے لئے قلم کو کدال بنا کر انھیں زمین کے نیچے دفن کرنے بیٹھ گئے ہیں۔

بھٹی صاحب نے جن اعلام کے متعلق اپنے مشاہدات، تجربات اور معلومات کے مطابق لکھا ہے وہ خوب ہے، وہیں وہ تذکرہ نگاری کا حق ادا کرتے ہیں اور اپنے مؤثر قلم سے وہ معجز نمائی کرتے ہیں جیسے وہ اپنے قلم کے ذریعہ زندہ لوگوں سے ان کی بات کروا رہے ہیں، وہ انھیں زندہ ومتحرک بنا دیتے ہیں اور کہیں انھیں ہنساتے ہیں کہیں رلاتے ہیں قلم کی طاقت یہی ہے اور اس کے جوہر کی یہی پہچان ہے۔ مولانا بھٹی نے اپنے عصر کے اعلام پر بھی لکھا ہے، خواہ وہ کسی مسلک کے ماننے والے ہوں، ہر ایک کے متعلق توازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور ہم عصروں میں جن کے ہاں شوخیاں، دعوی واریاں اور ڈراما بازیاں زیادہ رہی ہیں ان کی فکر ونظر اور حرکت ونشاط پر نقد ونظر سے بھی کام لیا ہے۔

مولانا کی تحریر کی خوبی ہے سلاست اور روانی۔ ان کی تحریروں میں حرارت اور زندگی ہوتی ہے، لذت اور چاشنی بھی ہوتی ہے۔ واقعی انسان کو ان کی تذکرہ نگاری اور ان کے اعلام سے انسپائریشن ملتی ہے، اگر تحریریں قاری کے اوپر اثر انداز ہو سکیں اور لوگ ان کے اثرات قبول کر لیں تو یہی قلم کار کا کمال ہے، آج اکثر تحریریں ہوا

بازی ہوتی ہیں یا تکلفات کا بوجھ۔ ایسی تحریریں کلیتاً افادیت سے خالی ہوتی ہیں اور قارئین پر کوئی اثر بھی نہیں چھوڑتی ہیں۔ عموماً وہ بس پر دھوشن ہوتی ہیں اور پریشان کن تلوث۔ کثرت سے جو لوگ لکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ آگے چل کر پھسڈی بن جاتے ہیں۔ مولانا بھٹی کی ساری تحریروں میں جان ہے، توانائی ہے، جانکاری ہے اور نقاط ہیں، زندگی ہے، اس لئے خوب پڑھی بھی جاتی ہیں، ہر حلقے میں ان کی تحریروں کو اعتبار حاصل ہے اور پذیرائی بھی۔

بھٹی صاحب نے موجودین کے متعلق بھی آخر میں لکھنا شروع کر دیا تھا، اس سے ان کی تذکرہ نگاری کا معیار انداز و اسلوب متاثر ہو گیا تھا۔ بہت سے ایسے ہیں جن کی شخصیت ہے، نہ کردار ہے، نہ علم و فن ہے لیکن وہ بھی لائن میں لگے نظر آتے ہیں کہ مولانا بھٹی انھیں اٹھالیں اور اپنے قلم سے ان کا بت سنوار دیں۔ ایسے لوگ اکثر بقلم خود ہیں۔ موجودین میں اگر بھٹی صاحب ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی جیسے باوقار ثقہ ذی علم اور جنون (Genuine) اعلام سے اپنی تذکرہ نگاری کو زینت بخشتے تو بہتر تھا۔ ان کی تذکرہ نگاری کے مسند پر ایسے لوگ بھی مسند نشین نظر آتے ہیں جن کی وقعت شاید ان اوراق کے برابر بھی نہ ہو جو ان کے متعلق تفصیلات سے آلودہ ہوئے ہیں۔

''چمنستان حدیث'' میں خاکسار پر بھی مولانا بھٹی نے عنایت کی ہے، جب میں نے یہ خبر سنی اور خود کتاب دیکھی تو دل سے یہ بات نکلی، کاش مولانا ہمارے تذکرے کو اس کتاب میں شامل نہ کرتے۔ ہم کیا اور ہماری حیثیت کیا۔ سوچا تھا اس پر ایک تبصرہ لکھ کر مولانا کی خدمت میں بھیجوں گا لیکن یہ الجھن دل سے نکل گئی جب ایک روز دس بجے دن میں فون کی گھنٹی بجی اور مولانا سے شرف تکلم حاصل ہوا۔ مولانا کی انکساری اور تواضع دیکھیے انہوں نے خبر دی کہ کل رات بھی انہوں نے ٹیلیفون کیا تھا لیکن میں گھر سے باہر تھا، مولانا نے پوچھا ''چمنستان'' ملاحظہ کیا؟ اس میں تمہارے متعلق لکھا ہے، میں نے کہا سنا ہے لیکن دیکھا نہیں ہے۔ مولانا نے میری تحریر کا بھی شکریہ ادا کیا جو ان کی تذکرہ نگاری کے متعلق ''ترجمان'' اور ''الاعتصام'' میں چھپی تھی اور مولانا محمد رمضان یوسف سلفی کی کتاب ''مورخ اہل حدیث محمد اسحاق بھٹی حیات خدمات'' کا ذکر کیا تھا جس میں یہ مضمون شامل کیا گیا ہے اور پوچھا کیا اسے ملاحظہ کیا ہے؟ میں نے بتایا دیکھا ہے۔ مولانا مرحوم سے میری یہ اول و آخر چند منٹ کی گفتگو تھی دیر تک اس گفتگو کا اثر باقی رہا۔ اس کی خوشبو دل دماغ کو معطر کر گئی ایک عظیم مصنف دوسرے ملک میں عمر کے آخری مرحلے میں، علی گڑھ میں موجود ایک کج مج کو لائق التفات جانتا ہے اور اس کے متعلق اپنی تحریر کی خبر دیتا ہے۔ یہ تواضع یہ انکسار خود متواضع اور منکسر المزاج انسان کے عظیم و کبیر ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

☆☆☆

(ص: ۷۲/ کا بقیہ)

یہ معلومات تلاش بسیار کے باوجود دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔ چنانچہ اسلام آباد (پاکستان) کے مجلّہ ''نقطۂ نظر'' کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء تا ستمبر ۲۰۰۰ء میں ''نقوش عظمت رفتہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان کے مایہ ناز صحافی آباد شاہ پوری رقمطراز ہیں:

''..... یہاں آپ ان حضرات کو علمی و مجلسی زندگی میں جلوہ افروز پائیں گے، انہیں شاگردوں کی رہنمائی کرتے، ان کی صلاحیتوں کو سراہتے اور سنوارتے، کانوں میں علم و حلم کا رس گھولتے اور لطائف کے شگوفے چھوڑتے دیکھیں گے۔ پھر فاضل مصنف ان اصحاب و رجال کے تراجم و سوانح ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ان کی اولاد اور قرابت داروں اور شاگردوں، اساتذہ اور ان کی اولاد و احفاد اور تربیت فکر و نظر کے انداز کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اور ضمناً جن شہروں اور دیہات سے ان اصحاب کا تعلق ہے، ان کا منظر و پس منظر اور تاریخ بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک بار جو یہ دفتر کھلتا ہے تو پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔'' [مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی: حیات و خدمات، از مولانا محمد رمضان یوسف سلفی، ص: ۱۴۰]

میرزا ادیب لکھتے ہیں:

''.....پھر ان کا انداز بیان رواں دواں ہوتا ہے۔ جس موقعے پر بھی کوئی بات لکھ دیتے ہیں لگتا ہے یہ بات اپنے مناسب مقام پر ہی آئی ہے۔ دلچسپ پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر انہیں یہ ہنر بھی آتا ہے کہ جہاں کہیں محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تحریر دیر ہضم ہونے لگی ہے تو جھٹ لطیفوں کا چورن استعمال میں لا کر اسے زود ہضم بنا دیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی خاطر ان کی ہر تحریر میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

.....وہ ایک انشائیہ نگار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں وہ اپنائیت موجود ہے جو ایک سچے انشائیہ نگار میں ہونی چاہیے۔

میں تو یہ کہوں گا کہ وہ اپنی تحریر میں ایک مجلسی آدمی کے علاوہ ایک لطیفہ باز کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں اور یہ ساری خوبیاں جو کتاب (بزم ارجمنداں) کے فاضل مصنف سے مختص ہیں کتاب کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیتی ہیں۔'' [بزم ارجمنداں، ص: ۱۵]

مولانا بھٹی علیہ الرحمۃ کے اسلوب نگارش پر مبنی یہ مختصر مضمون ناکافی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زبان و ادب سے ناواقف ہم جیسے نوآموز آپ کے اسلوب کی گہرائی و گیرائی کو پرکھ نہیں سکتے اور نہ ہی اس موضوع کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

# مؤرخ اہل حدیث: مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

مولانا محمد انور قاسم سلفی (کویت)

دور حاضر میں اگر تاریخ نویسی اور خاکہ نگاری کے متعلق بات کی جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اس تعلق سے محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ کا تذکرہ نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ بھٹی صاحب نے اپنی شگفتہ تحریر اور جادو بیانی سے اس فن کو تازگی اور اس فکر کو بالیدگی عطا فرمائی ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سارے برصغیر ہندو پاک میں گرچہ خاکہ نگار بے شمار ہیں، لیکن مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مولانا محمد اسحاق بھٹی وہ کہنہ مشق صحافی، مؤرخ، عالم دین، تجزیہ نگار اور خاکہ نگار ہیں، جو تقریباً ساٹھ سال سے اپنے رشحات قلم کی عطر بیزی سے ایک دنیا کے طالبان علوم دینیہ و وارثان علوم نبوت اور محبان اسلامی صحافت کی مشام روح کو معطر کئے ہوئے ہیں، گویا: عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میرے لئے یہ بات باعث سعادت ہے کہ میں اس عظیم مؤرخ، مصنف اور خاکہ نگار کا تعارف قارئین کی خدمت میں پیش کروں، جس نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال لوح وقلم کی خدمت میں لگا دیا اور اس عرصے میں کم وبیش پچاس ہزار سے زائد صفحات تحریر کیا، جسے اگر ایک ساتھ جمع کیا جائے تو کم از کم سو ضخیم جلدیں بنیں گی، جن کی علمی خدمات پر طلباء نے ایم اے اور Phd کے مقالات لکھے اور برصغیر ہندو پاک کے بے شمار مجلات ورسائل میں شائع ہونے والی جن کی تحریریں ساری دنیا کے چپے چپے میں پہنچ رہی ہیں گویا:

کچھ قمریوں کو یاد ہے ، کچھ بلبلوں کو حفظ

اور

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اور جن کا قلم سیال ۹۰ رسال کی اس عمر میں بھی مضامین نو کے انبار لگا رہا ہے:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اور جو اس عمر میں بھی صحافت کی آبرو بنے ہوئے ہیں اور اس بڑھاپے میں بھی جن کی یادداشت عہد رفتہ کو بس ایک آواز دے کر بلا لیتی ہے، گویا:

نگاہ میں ہے عہد رفتہ اب بھی حال کی طرح
سلف کا شیوہ سامنے ہے ایک مثال کی طرح

آیئے اس پُر بہار شخصیت سے قارئین کی آدھی ملاقات کراوں۔

## نام ونسب اور ولادت:

مولانا محمد اسحاق بھٹی بن عبدالمجید بن محمد بن دوست محمد بن منصور بن خزانہ بن جیوا۔ آپ کے جد امجد جیوا، مہاراجا پٹیالہ کے درباری تھے، میاں جیوا کی آل واولاد طلب روزگار کے لئے پنجاب کے مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں چلی گئی، جن میں سے اکثر تقسیم ملک سے پہلے کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) مشرقی پنجاب میں آباد ہوگئے، آپ کی پیدائش یہیں ۱۵ رمارچ ۱۹۲۵ء کو ہوئی پانچ سال کی عمر میں دادا مرحوم سے قرآن مجید ناظرہ اور اردو لکھنا پڑھنا شروع کیا، ساتھ ہی سرکاری سکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا اور یہیں چوتھی جماعت تک پڑھ کر پرائمری پاس کیا۔

## تعلیم وتربیت:

طبیعت چونکہ علوم دینیہ کی طرف مائل تھی، اس لئے اس وقت کے جید عالم دین، شارح سنن نسائی اور ادارہ الدعوۃ السلفیہ اور ہفت روزہ مجلّہ ''الاعتصام'' کے بانی حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف محدث بھوجیانی رحمہ اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، جو موضع بھوجیان، تحصیل ترنتارن، ضلع امرتسر کے رہنے والے تھے، جو اس وقت خطابت وتدریس کے لئے ''کوٹ کپورہ'' کی انجمن اصلاح المسلمین کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے تھے، آپ نے مولانا مرحوم سے نحو، صرف، بلاغت، عروض، منطق وفلسفہ، بیان ومعانی، فقہ واصول فقہ، حدیث وتفسیر کی ساری کتابیں جو اس زمانے میں درس نظامی میں شامل تھیں، مولانا رحمہ اللہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۹ء کے عرصے میں پڑھیں۔ پھر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۱ء تک شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ (خسر علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ) اور حضرۃ العلام شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی خدمت میں گوجرانوالہ میں رہ کر کسب فیض کیا۔ مشہور مجاہد آزادی، دینی، علمی اور سیاسی لیڈر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور صاحب تصانیف کثیرہ، متکلم زماں حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہما اللہ کی فیض صحبت وتربیت نے آپ کی علمی وفکری زندگی کو جلا بخشا، اپنے ان مشفق مربیان کرام کے متعلق مولانا خود رقم طراز ہیں:

''میری تربیت جن علمائے کرام میں ہوئی ہے وہ نہایت اونچی شخصیتیں تھیں، وہ بے حد معتدل مزاج تھے اور اپنی بات مثبت انداز میں کرتے تھے، منفی نقطۂ نظر سے کوسوں دور تھے، ان میں سے کسی نے بھی کفر وشرک، الحاد وبے دینی کے فتوے جاری نہیں کئے، وہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے خواہاں تھے اور اسی کے لئے کوشاں رہتے تھے، ان میں سے کسی نے نہ الحاد کی دوکان لگائی، نہ یہ کفر کی تقسیم کے لئے کوشاں ہوئے، نہ لوگوں کو مشرک بنانے کا دھندہ کیا، نہ کسی کو جنت سے نکالنے اور جہنم میں داخل کرنے کی کوشش کی''۔

## جہاد آزادی میں قید وبند:

مولانا نے جن حالات میں ہوش سنبھالا، وہ استعمار کے زوال اور صبح آزادی کے طلوع ہونے کا زمانہ تھا، انگریز اس خطے پر اپنے ناپاک قبضے کو دوام بخشنے کے لئے سارے گُر اور ہتھکنڈے استعمال کررہے تھے اور آزادی کے پروانے بھی حصول آزادی کے لیے سر سے کفن باندھ چکے تھے، وہ دور جس میں مولانا آزاد کے ''الہلال''، ''البلاغ''، مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ''، علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی، مولانا ظفر علی خان ظفر کے ''زمیندار'' اور شبیر احمد جوش ملیح آبادی کی انقلابی نظموں اور تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون اور تحریک ''ہندوستان چھوڑ دو'' جیسی تحریکوں نے ہر اس شخص کو جس کے دل میں وطن عزیز کے لئے تھوڑا سا بھی جذبۂ قربانی ہو، سرفروشی کی تمنا لیکر سڑکوں پر کھینچ لایا تھا، اور عالم یہ تھا کہ تاجروں نے تجارت چھوڑ دی، کسانوں نے ہل، علماء نے مدارس اور ملازمین نے اپنی سرکاری ملازمتوں کو چھوڑ کر ساری قوم استعمار کے آگے سینہ سپر ہوگئی، بھلا ایسے حالات میں مولانا بھٹی تحریک آزادیٔ وطن سے اپنا دامن کیسے بچا سکتے تھے، آپ نے استخلاص وطن کے لئے اپنی ریاست کی ''پرجا منڈل'' میں شمولیت اختیار کرلی، جس کے صدر اس زمانے میں گیانی ذیل سنگھ جی تھی، جو بعد میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ، پھر مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ اور پھر ۱۹۸۲ء سے لیکر ۲۴ر جولائی ۱۹۸۷ء کے درمیانی وقفے میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ بنے اور اس کے سکریٹری ہمارے ممدوح مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب تھے، اس ''پرجا منڈل'' کو آزادی کی صبح تک کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور کس مد وجزر سے گذرنا پڑا مولانا نے اس کی تفصیل اپنی کتاب ''نقوش عظمت رفتہ'' میں اپنے بچپن کے دوست اور تحریک آزادی کے ہم سفر ''گیانی ذیل سنگھ'' کے تذکرے میں اس خوب صورتی سے بیان کیا ہے کہ اس دور کی مشرقی پنجاب کی ساری جدوجہد آزادی کا حسین مرقع آنکھوں میں پھر جاتا ہے، لکھتے ہیں:

''دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء کے آخر میں پنجاب کی ریاستوں میں پھر تحریک آزادی شروع ہوگئی، یہ تحریک بہت زوردار تھی اور ۱۹۴۶ء میں اس نے شدت اختیار کرلی تھی، ہماری ریاست بھی اس تحریک کی زد میں آچکی تھی، ریاست میں دفعہ ۱۴۴ر نافذ تھی اور جلسے جلوس کی قطعی ممانعت۔ ان حالات میں طے کیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴ر توڑی جائے، سول نافرمانی شروع کردی جائے اور پانچ پانچ آدمی گرفتاریاں پیش کریں، اس کے لئے پہلے تو ہم لوگ فیروز پور گئے، وہاں گوکھلے میدان میں سائبان نصب کئے اور ڈیرہ لگالیا، پھر فرید کوٹ شہر کے ریلوے سٹیشن کو مرکز بنایا گیا جو انگریزی علاقہ ہونے کی وجہ سے ریاستی حکومت کے دسترس سے باہر تھا، جون کا مہینہ گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا کہ دن کے گیارہ بجے پانچ آدمیوں کا پہلا جتھا نعرے لگاتا ہوا آیا اور ریلوے لائن عبور کرکے ریاست کی حد میں داخل ہوگیا، اس جتھے میں دو مسلمان، میں (مولانا محمد اسحاق بھٹی) اور قاضی عبید اللہ (جن سے فرید کوٹ جیل میں گیانی ذیل سنگھ نے اردو اور قرآن پڑھنا سیکھا تھا) دو سکھ بھائی دیال سنگھ اور لہنا سنگھ اور ایک ہندو چیتن دیو شامل تھے۔ جہاں انہیں فی الفور گرفتار کرلیا گیا، گرفتاری کی اس تقریب میں بے شمار لوگ جمع تھے جو ریاستی حکومت کے خلاف اور گرفتاری دینے والوں کے حق میں زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ مسلمان، سکھ اور ہندو ایسے بھی تھے جو چند گز کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن کے اندر کھڑے ہماری مخالفت میں تقریریں کررہے تھے۔ ایک مولوی صاحب فرید کوٹ کے سکھ حکمران ہر اندر سنگھ کو ''اولو الامر'' قرار دے کر اس کی اطاعت کا اعلان فرمارہے تھے۔ ان تقریروں کا ہمارے بعض ساتھی اسی لب ولہجے میں جواب دینا چاہتے تھے، لیکن سب کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے رہے، وہ بار بار کہتے تھے کہ یہ لوگ ہمیں اشتعال دلا کر تحریک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن ہمارا فرض ہے کہ حالات کا پورے صبر وتحمل کے ساتھ مقابلہ کریں اور ہر صورت میں امن وشانتی کی فضا برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔''

## فرید کوٹ جیل سے رہائی:

اپنی رہائی کے متعلق خود تحریر فرماتے ہیں:

''فرید کوٹ کے داروغہ جیل کا نام عجائب سنگھ تھا، بہت شریف اور نرم آدمی تھا، حتی الامکان کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا، ایک دن دس بجے کے قریب وہ ہمارے پاس آیا اور کہا: میں صابن بھیج رہا ہوں، مہربانی کرکے آج آپ اپنے کپڑے دھولیں۔ ہم اس پر متعجب ہوئے، کیونکہ آج صابن ملنے والا دن اتوار نہیں تھا، دوسرے دن دس بجے کے قریب عجائب سنگھ آیا اور کہا: مہربانی فرما کر میرے ساتھ چلئے۔ وہ دیوڑھی میں لے گیا، ہم نے دیکھا کہ ایک گورے چٹے صاحب وہاں تشریف فرما ہیں، ان کے ساتھ ریاست کے چیف سکریٹری رام سنگھ بیٹھے ہیں، ہمیں دیکھ کر یہ دونوں کھڑے ہوگئے اور سب سے ہاتھ ملائے۔ کھدر پوش آدمی نے چیف سکریٹری سے کہا: آپ تشریف لے جائیے میں ان سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھا کہ یہ بھیم سین سچر ہوں گے، لیکن انہوں نے بتلایا: ''میرا نام سیف الدین کچلو ہے اور میں پنجاب کانگریس کا صدر ہوں''۔ میں نے ان سے کہا: ''پنجاب کانگریس کے صدر تو مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے''۔ انہوں نے بتایا: نئے انتخاب میں مولانا داؤد غزنوی صدر نہیں رہے، اب یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔ ڈاکٹر کچلو نے بتایا کہ باہر تحریک زوروں پر چل رہی ہے، یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے کانگریس ہائی کمان نے مجھے یہاں بھیجا ہے، ایک دو دن میں پنڈت جواہر لال نہرو یہاں آرہے ہیں، وہ مہاراجہ سے گفتگو کریں گے، پرجا منڈل کے مطالبات مان لئے جائیں گے اور آپ لوگوں کو رہا کردیا جائے گا۔

کچھ عرصے بعد پنڈت نہرو فرید کوٹ آئے، لیکن ریاست میں دفعہ ۱۴۴ر نافذ تھی، وہ بذریعہ ریل آئے، بہت بڑا ہجوم ان کے استقبال کے لئے فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر جمع تھا، وہ ہجوم کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے شہر میں داخل ہونے

لگے تو فیروز پوری دروازے پر ایک ہندو مجسٹریٹ کھڑا تھا، اس نے ان کو کاغذ دکھایا اور کہا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے، آپ اندر نہیں جاسکتے۔ پنڈت جی نے کاغذ کا وہ پرزہ ان کے ہاتھ سے پکڑا اور اسے پھاڑ کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہا: ''ہم اس طرح کے کاغذ کے پرزوں کو اسی طرح کیا کرتے ہیں''۔ پھر ہجوم سے مخاطب ہوکر بولے: ''بڑھو نوجوانو!''۔ اس کے بعد وہ غلہ منڈی گئے اور وہاں جاکر تقریر کی۔ بعد ازاں راجہ فرید کوٹ ہر اندر سنگھ نے اپنی کار بھیجی اور پنڈت جی کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ وہ وہاں گئے اور دونوں نے باہم بات چیت کی۔ اس کے نتیجے میں ہمیں رہا کردیا گیا۔ (نقوش عظمت رفتہ: ۵۵۵۔۵۵۶)

یہ مولانا بھٹی صاحب کی دوسری گرفتاری تھی، جب کہ اس سے پہلے بھی آپ ۱۹۳۹ء میں وطن عزیز کی آزادی کے لئے کچھ عرصہ فیروز پور جیل میں قید وبند کی صعوبتیں جھیل چکے تھے۔ گویا بھٹی صاحب نے سیاست میں قدم اس دور میں رکھا تھا جس کے متعلق شورش کاشمیری مرحوم نے فرمایا تھا:

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں

**تقسیم ملک کے بعد:**

تقسیم ملک کے بعد کیا بیتی؟ آپ خود اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو ملک تقسیم ہوگیا تو ۲۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہم اپنے قدیم مسکن سے نکلے اور قصور آگئے، ایک مہینہ دس دن وہاں رہے پھر اپنے خاندان کے ساتھ ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی تحصیل جڑاں والہ کے ایک گاؤں چک نمبر ۵۳ر گ ب منصور پور میں آگئے، یہ وہی لائل پور ہے جسے ہم نے مسلمان بنا کر ''فیصل آباد'' کے نام سے موسوم کردیا ہے، کافر کو مسلمان بنایا جائے تو سنا ہے بہت ثواب ہوتا ہے، چنانچہ حصول ثواب کے لئے ہم نے بے شمار گلیوں، محلوں، سڑکوں، دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کو مسلمان بنا دیا ہے اور اللہ کی مہربانی سے اس طرح ہم جنتی ہوگئے ہیں، علاوہ ازیں سکولوں اور کالجوں کو بھی ہم نے دائرہ اسلام میں داخل کرلیا ہے اور اس طرح جنت الفردوس میں داخلہ اپنے لئے پکا کرلیا ہے۔ ہمارے موجودہ گاؤں چک ۵۳ر گ ب ڈھیسیاں بھی کہا جاتا ہے۔

بہر حال جب ہم گھر سے نکلے تو کوئی چیز ہمارے پاس نہیں تھی، نہ کوئی کپڑا، نہ کوئی چھوٹا بڑا برتن۔ میری عربی، اردو اور فارسی کی تین سو کے قریب کتابیں تھیں وہ بھی وہیں رہ گئیں اور وہ سندیں بھی جو مشفق ترین اساتذہ نے انتہائی کرم فرماتے ہوئے، اس کم علم اور بے عمل کو عطا فرمائی تھیں، کتابوں میں رہ گئیں۔ (خودنوشت سوانح حیات: ۲)

۲۴ر جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا قیام لاہور میں عمل میں آیا تو کرم فرما اساتذہ (حضرۃ العلام مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ) کے کہنے سے مجھے اس کا ناظم دفتر بنا دیا گیا، اس کے صدر حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ تھے۔ پھر ۱۹ر اگست ۱۹۴۹ء کو گوجرانوالا سے جب ہفت روزہ الاعتصام جاری ہوا تو اس کا ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندویؒ کو مقرر کیا گیا، کچھ عرصہ بعد مجھے اس اخبار کا معاون مدیر بنا دیا گیا، یہ میری زندگی کا نیا تجربہ اور نیا دور تھا، مجھے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی بہت جلد میرا پیشہ بن گئی۔ (خودنوشت سوانح حیات: ۲۷)

**میدان صحافت میں:** حالات نے کروٹ لی ۱۵ر مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا محمد حنیف ندویؒ ریسرچ فیلو کی حیثیت سے ادارہ ثقافت اسلامیہ (لاہور) سے منسلک ہوگئے، ان کی جگہ بھٹی صاحب کو ''الاعتصام'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، آپ پندرہ سال تک اس کے ایڈیٹر رہے اس دور میں بے شمار علماء وزعماء سے میل ملاقات اور گفتگو کے مواقع ملے، جن سے آپ نے خوب استفادہ کیا اور اس دوران آپ نے ''الاعتصام'' کے کئی نمبر شائع کئے، جن میں فروری ۱۹۵۶ء کو شائع ہونے والا ''حجیت حدیث نمبر'' مئی ۱۹۵۷ء کو شائع ہونے والا ''۱۹۵۷ء نمبر'' قابل ذکر ہے، جو کہ جہاد آزادی کا ایک اہم تحقیقی اور برصغیر کی سیاسی دستاویز ہے، اس کے علاوہ آپ نے کئی عید نمبر اور آئین نمبر وغیرہ کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا تھا، اخبار الاعتصام کے دفتر کے متعلق دلچسپ معلومات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑے سائز کے سولہ صفحات کے اخبار کا میں خود ہی خاکروب، خود ہی چپراسی، خود ہی کلرک، خود ہی مینیجر اور خود ہی ایڈیٹر تھا، یعنی ان تمام مناصب پر میں اکیلا قابض تھا۔ الحمدللہ رب تعالیٰ نے بڑی توفیق عطا فرمائی تھی۔

اسی دوران جنوری ۱۹۵۸ء کو اپنا ذاتی اخبار سہ روزہ ''منہاج'' جاری کیا جو اگست ۱۹۵۹ء تک جاری رہا۔ نیز اسی دوران روزنامہ ''امروز''، روزنامہ ''پاکستان'' میں کئی سال تک مضمون نویسی اور کالم نگاری کیا۔ نیز مشہور صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی کے ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' میں ایک عرصے تک شخصیات پر سلسلہ تحریر جاری رکھا۔

پھر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا تو ۳۰ر مئی ۱۹۶۵ء کو اخبار ''الاعتصام'' کی ادارت سے مستعفی ہوکر چند ماہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنویؒ کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''توحید'' جاری کیا، پھر ۱۱ر ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس سے علاحدگی اختیار کرلی۔

**ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی:** ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۵ء کو مشہور اسلامی تحقیقی ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' نے بغیر کسی درخواست کے ریسرچ سکالر کی حیثیت سے آپ کی خدمات حاصل کرلیں، یہ وہ ادارہ ہے جو برصغیر کے معروف محققین کا مرکز تھا، جن میں اس ادارہ کے ڈائرکٹر شیخ محمد اکرام، مولانا محمد حنیف ندوی، سید جعفر شاہ پھلواروی، رئیس احمد جعفری وغیرہم ہیں۔ یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا، جس میں بھٹی صاحب کو خالص تحقیقی میدان سے واسطہ پڑا، آپ کے لئے

یہ علم کی نئی وادی تھی جس میں آپ کو قدم رنجہ ہونے کا موقع ملا، اس ادارے میں آ کر بھٹی صاحب کے علمی جوہر ایسے کھلے کہ میدان تحقیق کے متوالوں کے لئے علم کا ایک دبستان وجود میں آ گیا، اس ادارے سے آپ بتیس (۳۲) سال وابستہ رہے اور آپ کے رشحات قلم سے مندرجہ ذیل کتابیں معرض وجود میں آئیں، ان میں سے کچھ آپ کے شہوار قلم کی عطر بیزیاں ہیں اور کچھ قدیم کتابوں کا ترجمہ، تحقیق اور تعلیق، جو مختصر طور پر اس طرح ہیں:

(۱)۔ **الفہرست**: محمد بن اسحاق بن ندیم الوراق البغدادی (متوفی ۳۹۱ھ) کی عربی تالیف ہے، جو بہت سے علوم وفنون اور ان کی تاریخ پر مشتمل ہے، نو سو چودہ (۹۱۴) صفحات پر مشتمل اس کتاب کا آپ نے ترجمہ کیا، بے شمار مقامات پر حواشی لکھے اور اشاریہ بنایا، یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں ادارہ سے چھپی۔

(۲)۔ **فقہائے ہند وپاک**: (دس جلدوں میں) ۳۵۳۴ رصفحات پر مشتمل اس کتاب میں آپ نے پہلی صدی ہجری سے لیکر تیرھویں صدی تک کے فقہاء پر مشتمل ہے، اپنے موضوع کی یہ واحد کتاب ہے جو برصغیر کے علماء وفقہاء کے بارے میں اردو میں لکھی گئی۔ اس موضوع پر آپ نے پاکستان کی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب ایس اے رحمان صاحب کے مشورے سے قلم اٹھایا۔

(۳)۔ **برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش**: صفحات: ۲۲۴، طبع ۱۹۸۹ء۔

(۴) **ارمغان حنیف**: آپ کے استاذ محترم، دیرینہ دوست اور رفیق کار مولانا محمد حنیف ندویؒ کے حالات زندگی پر مشتمل۔ صفحات: ۳۷۱، طبع: ۱۹۸۹ء۔

(۵) **اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ**: ۱۸۵۷ء تک کے شمالی ہند کے علماء پر مشتمل یہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا، جسے آپ نے ایڈٹ کیا، اس پر مقدمہ لکھ کر ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے شائع کیا۔ صفحات: ۲۲۴، ۱۹۸۹ء۔

(۶) **شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور ان کی علمی خدمات**: یہ ڈاکٹر ثریا ڈار (سابق چیر پرسن شعبۂ عربی اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور) کا Phd کا مقالہ ہے، جسے آپ نے ایڈٹ کیا اور اس کی عربی وفارسی عبارتوں کا ترجمہ کیا اور اس پر مقدمہ لکھ کر ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے شائع کیا۔ صفحات: ۳۲۵، طبع ۱۹۹۱ء۔

(۷) **شروح صحیح بخاری**: یہ محترمہ غزالہ حامد کا ایم اے کا مقالہ ہے جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کر کے عربی وفارسی عبارتوں کا ترجمہ کیا، نیز ان شروحات کا تذکرہ بھی کیا جسے مقالہ نگار نے ذکر نہیں کیا، پھر اس پر مقدمہ لکھ کر ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے شائع کیا۔ صفحات: ۱۷۵، طباعت: ۱۹۹۴ء۔

۸۔ **پیغمبر انسانیت**: نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مولانا سید جعفر شاہ پھلواروی کی تصنیف، جسے بھٹی صاحب نے ایڈٹ کر کے، عربی عبارتوں کا ترجمہ کر کے اور پھر اس پر مقدمہ لکھ کر شائع کیا، صفحات: ۵۵۰۔

(۹) **فقہ عمر**: مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ کا ترجمہ، نظر ثانی اور ایڈیٹنگ کے بعد ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے شائع کیا۔ صفحات: ۴۰۰، طباعت: ۱۹۷۵ء۔

(۱۰) **ماہنامہ ''المعارف''**: یہ ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے نشر ہونے والا ماہانہ رسالہ تھا، جس میں خالص تحقیقی مقالات شائع ہوتے تھے، بھٹی صاحب اس علمی مجلے کے بائیس سال ایڈیٹر رہے، اس دوران آپ نے سینکڑوں اداریے، مضامین، کتابوں پر نقد وتبصرے، حالات حاضرہ پر ''دید وشنید'' کے نام سے دلچسپ وپر مغز تبصرے وغیرہ اس رسالے میں لکھے۔

اس طرح بتیس سال اس ادارے میں مختلف طرح کی علمی وتحقیقی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۶ر مارچ ۱۹۹۶ء کو اس سے سبک دوش ہو گئے۔

''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' میں ملازمت کے بتیس سال کے عرصے میں، بھٹی صاحب نے ادارہ سے ہٹ کر اپنے طور پر جو کتابیں تصنیف فرمائیں، مقالے لکھے، اس کی مختصر سی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ **جمع وتدوین قرآن**: مقالہ برائے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، طباعت: ۱۹۷۶ء۔

۲۔ **فضائل قرآن**: مقالہ برائے اردو دائرہء معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، طباعت: ۱۹۷۶ء۔

۳۔ **مضامین قرآن**: مقالہ برائے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، طباعت: ۱۹۷۶ء۔

۴۔ **واقعات وقصص قرآن**: مقالہ برائے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، طباعت: ۱۹۷۶ء۔

۵۔ **اعجاز قرآن**: مقالہ برائے اردو دائرہء معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، طباعت: ۱۹۷۶ء۔

ان مقالات کے علاوہ متعدد موضوعات پر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی کی مختلف جلدوں میں تیس بتیس مقالات شائع ہوئے۔

۶۔ **قصوری خاندان**: اس کتاب کا تعلق مشہور وکیل اور مجاہد آزادی حضرت مولانا عبد القادر قصوری مرحوم اور ان کے فرزندان گرامی مجاہد آزادی مولانا محی الدین احمد قصوری (والد معین قریشی سابق نگران وزیر اعظم پاکستان) مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، مولانا احمد علی قصوری اور میاں محمود علی قصوری مرحوم (والد خورشید احمد قصوری، سابق وزیر خارجہ پاکستان) کے تذکرے، ملک وملت اور وطن عزیز کے لئے ان کی ناقابل فراموش خدمات پر مشتمل ہے۔ صفحات: ۲۰۸۔ طباعت ۱۹۹۴ء۔

**بھٹی صاحب کی دیگر کتابیں**: ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں تحریر فرمائیں:

۱۔ **لسان القرآن جلد سوم**: یہ کتاب قرآن مجید کی توضیحی لغت کے متعلق ہے، اس کی پہلی اور دوسری جلد مولانا محمد حنیف ندویؒ کی تحریر فرمودہ ہیں، ان کی وفات کے

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

نبوی کی مشہور کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کی تلخیص پیش کرنی تھی، یہ روزانہ بیس منٹ کا پروگرام تھا، پھر اسی پروگرام کو اسی انداز سے پنجابی میں پیش کرنے کو کہا گیا، اس پروگرام کو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں بھٹی صاحب نے بہترین انداز میں پیش کیے۔

ریڈیو پاکستان لاہور نے ''زندہ تابندہ'' شروع کیا تو اس کے منتظمین نے بھٹی صاحب سے اصرار کیا کہ وہ اس پروگرام میں اہم فوت شدہ شخصیات کا تذکرہ کریں، موصوف نے مسلسل ۴۵ دن یہ پروگرام کیا اور اس میں شیخ الکل فی الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا شرف الدین دہلوی، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، حافظ عبد المنان وزیر آبادی، مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہم اللہ جیسی متعدد شخصیات کا تذکرہ فرمایا۔

بھٹی صاحب کو پہلی مرتبہ ۲۷ جولائی ۱۹۷۲ء کو TV پر ''بصیرت'' پروگرام کرنے کی دعوت دی گئی، اس کے بعد بارہا آپ نے ٹی وی پر متعدد پروگرام پیش کیے شرعی عدالت کی طرف سے بھٹی صاحب کو اطلاع آئی کہ وہ آپ کو اہم شرعی مسائل میں مشیر مقرر کرنا چاہتی ہے، لیکن آپ نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس سے میری تصنیفی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

ایک مرتبہ خود اسلامی نظریاتی کونسل کے چیرمین اور بھٹو دور کے سابق وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے بھٹی صاحب سے انکے دفتر ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' میں آ کر آپ سے کونسل کی رکنیت قبول کرنے کے لئے اصرار کیا، یہ عہدہ جسکے حصول لئے لوگ واسطے وسیلے لڑاتے ہیں، لیکن بھٹی صاحب کی درویشی کہ آپ نے اپنی علمی مشغولیتوں کے پیش نظر معذرت کر لی۔

یہ تھے بھٹی صاحب کے کچھ مختصر حالات، آپ نے اپنی عمر عزیز کا ایک ایک لمحہ دین اسلام کی خدمت، جماعت اہل حدیث اور رجال اہل حدیث کی تاریخ نویسی میں لگا دیا، عموماً اہل قلم لکھنے میں کچھ اور دکھنے میں کچھ ہوتے ہیں، کئی ایسے علماء ہیں جن کی تحریروں سے ایک دنیا متاثر ہے، لیکن جب صاحب تحریر سے ملاقات کی تو وہ عبوسا قمطریرا اور انتہائی خشک مزاج ثابت ہوئے، لیکن ہمارے یہ ممدوح اپنی تحریر کے سچے سفیر ہیں، جس طرح ان کا قلم زعفران زار ہے، اسی طرح آپ بھی نہایت سادہ اور شگفتہ مزاج ہیں سچی بات تو یہ ہے کہ، ایسے ''خوش طبع'' لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے شاید اسی لئے میر نے کہا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

شاید میر مرحوم کو حالات نے ''پراگندہ طبع'' کر دیا ہو، لیکن ہمارے ان ممدوح کو، حالات کی سختی، بڑھتی عمر، اشغال کے ہجوم اور بے پناہ مصروفیتوں نے ''خوش طبع'' اور شاکر و صابر بنا دیا۔ سچ ہے:

رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

موصوف اپنی ذات پر اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسان، کرم اور نوازشوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں ایک غریب اور غیر معروف خاندان کا غریب اور غیر معروف فرد ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے علمی حلقوں میں بے حد اعزاز بخشا، میں پوری طرح اس کا شکر ادا بھی نہیں کر سکتا، بعض دفعہ اس قسم کی باتیں ذہن میں آتی ہیں تو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ کہاں یہ فقیر اور کہاں اللہ عزوجل کی رحمت بے پایاں؟''۔

مرکز دعوۃ الجالیات (جمعیت اہل حدیث) کویت نے محترم مولانا بھٹی صاحب کو کویت بلا کر، جماعت اہل حدیث کے لئے ان کی بے مثال اور شاندار خدمات پر اعزاز عطا کرنے کا فیصلہ کیا، رئیس مرکز محترم شیخ عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ نے مولانا موصوف کے کویت آمد کی راہ ہموار کی، نیز مرکز کے تمام احباب اور شیوخ بالخصوص محترم شیخ عبد الخالق، محترم عبد اللہ شاد، حاجی حبیب الرحمٰن، حاجی ارشد صاحب، شیخ بشیر الطیب، حاجی امین صاحب، حاجی مظہر ریاض، جناب ابوکلیم، جناب ملک جاوید، شیخ کفایت اللہ اور راقم الحروف نے اس کے لئے بھرپور تیاریاں کیں، پھر مورخہ ۳/۷/۲۰۰۸ء بروز جمعرات بعد نماز عشاء، جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی قرطبہ کے پروگرام ہال میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا، ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لوگ بھٹی صاحب کو دیکھنے اور ان کی گفتگو کو سننے کے لئے امنڈ پڑے تھے، شوق کا عالم یہ تھا، کہ گویا:

آہٹ پہ کان، در پہ نظر، دل میں اشتیاق
کچھ ایسی بے خودی ہے تیرے انتظار میں

اس مبارک اجتماع میں دینی، دعوتی اور رفاہی کاموں کی عالمی تنظیم جمعیت احیاء التراث الاسلامی کے رئیس اور قافلہ خیر کے میر کارواں فضیلۃ الشیخ طارق سامی سلطان العیسیٰ حفظہ اللہ نے مرکز دعوۃ الجالیات کی جانب سے ''مورخ اہل حدیث'' کے خطاب والی شیلڈ محترم مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی خدمت میں پیش کی، اس اجتماع کو فضیلۃ الشیخ دکتور وائل الحساوی، نائب رئیس جمعیت احیاء التراث الاسلامی، فضیلۃ الشیخ فلاح خالد فلاح المطیری رئیس لجنۃ القارۃ الہندیہ، فضیلۃ الشیخ عبد العزیز المفرج رکن لجنۃ القارۃ الہندیہ، مشہور کویتی محقق فضیلۃ الشیخ محمد ناصر العجمی اور برصغیر کے معروف عالم دین اور محقق محترم شیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہم اللہ نے، اپنی آمد اور حاضری سے رونق بخشا۔

اخیر میں ہم بھٹی صاحب کی ساٹھ سالہ علمی، دینی، تاریخی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں، جو بھرپور مجاہدانہ زندگی گزار کر ۲۲ دسمبر ۲۰۱۵ء کو ہم سب سے جدا ہو گئے۔

اللہ اپنے اس نیک بندے کی خدمات نیرہ کو شرف قبولیت سے نواز کر مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

# مسلکِ حق کا ایک غیور مؤرخ

مولانا عبدالرزاق عبدالغفار سلفی (دبئی۔ متحدہ عرب امارات)

تلخیاں سارے زمانے کی پیے جاتے ہیں
ہم کو جینا ہے بہر حال جیے جاتے ہیں
(فراق)

''میں 'الاعتصام' کی ادارت سے مستعفی ہوتا ہوں، مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا قلم مسلک اہل حدیث کی خدمت کے لیے ہمیشہ متحرک رہے گا۔''
(نقوش عظمت رفتہ، ص:۲۲۳)

یہ تحریر ۳۰ رمئی ۱۹۶۵ء کی ہے اور یہ تحریر مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کے اس استعفیٰ کی ہے جو انھوں نے ''الاعتصام'' کی ادارت سے وابستگی کے پندرہ سال بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے امیر محترم کو لکھا تھا، اس تحریر میں اپنے اوپر کی گئی زیادتیوں کا اظہار اور ''حسابِ دوستاں'' کے خلاف بھرپور احتجاج ہے، مسلک اہل حدیث سے قلبی لگاؤ ومحبت کا اقرار ہے اور اس کے دفاع کے لیے قلم کو مسلسل حرکت میں رکھنے کا عہد وپیمان بھی ہے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمۃ اللہ علیہ نے مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے امیر سے جو وعدہ کیا اور عہد وپیمان باندھا اس کو زندگی بھر نہایت خوبی کے ساتھ نباہا بھی اور اپنی آخری سانس تک اس پر کاربند رہے، ان کی تمام تحریریں اس بات کا منہ بولتی ثبوت ہیں کہ انھوں نے مسلک حق کی خدمت میں اور اس کے دفاع میں اپنی پوری عمر لگادی، وہ بے حد وسیع المشرب، وسیع النظر والقلب انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ ہر مکتب فکر کے شخص کے ساتھ ان کے روابط اور تعلقات بہت قوی تھے اور اس بات کے ثبوت میں وہ خاکے پیش کیے جاسکتے ہیں جو انھوں نے مختلف شخصیات پر پوری شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے، حتی کہ ان خاکوں میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ مثلاً سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ ان تعلقات کو استوار رکھنے کے باوجود ان کی دین داری مسلکی حمیت اور عقیدے کی پختگی میں ذرہ برابر بھی کہیں لچک نظر نہیں آتی ہے، ان کی تحریر میں طنطنہ وشعلہ نوائی بھی ہے اور انکساری و خاکساری کے ساتھ ساتھ شگفتہ نوائی بھی، ان کی تحریر زندگی کے لیے حرارت ہے اور غمِ زندگی میں شراکت بھی، وقار، سنجیدگی اور لطافت کے ساتھ ساتھ اس قدر بے ساختہ پن کہ کتاب شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہ چاہے، مجھے شرر لکھنوی، راشد الخیری، عبدالمجید سالک، شوکت تھانوی، عبدالماجد دریا آبادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق، نیز نسیم حجازی، صادق سردھنوی اور التمش کی تحریروں سے زیادہ مزہ بھٹی صاحب کی تحریر میں آیا، حقیقت سے بھرپور چلتی پھرتی خوشی اور غم لیے ہوئے ایک باغ وبہار بلکہ سدا بہار طرزِ تحریر کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

بھٹی صاحب ایک بہت بڑے انشاء پرداز، مقالہ نگار، صحافی اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم تاریخ نویس تھے، ان کے قلم کی گل کاری قابل تقلید وقابل رشک ہے، ان کی تحریر متانت وسنجیدگی کے ساتھ ساتھ رعنائی وزیبائی سے پر ہے، ان کی تحریر میں نہ تو ذہنی عیاشی ہے اور نہ قلم کی قلابازیاں، ان کے قلم سے ادب وانشاء کے شرارے نکلتے ہیں، ان کی طرزِ تحریر صاف وسادہ ہے لیکن ان کی نثر میں شاعرانہ کیف وسرور ملتا ہے، غرض کہ ان کی تحریر میں وقار بھی ہے اور جمال بھی، ان کی سحر نگاری اور حسن بیان میں جو سوز وساز ہے کسی دوسرے شخص کی تحریر میں نظر نہیں آتی ہے، ان کے فکر وخیال کی رفعتوں، ذہن ودماغ کی بلندیوں اور ان کی نظر ونگاہ کی وسعتوں کو قید تحریر میں لانا آسان کام نہیں ہے۔

جی چاہتا ہے کہ سلطان القلم ومفکر جماعت استاذ محترم شیخ عبدالمعید مدنی حفظہ اللہ وتولاہ ومتعنا اللہ بطول حیاتہ کے الفاظ کو مستعار لے لوں اور کہہ دوں کہ جب بھٹی صاحب کی تحریروں کو پڑھا تو:

''کہیں رویا، کہیں مسکرایا، کہیں قہقہہ لگایا، کہیں عش عش کیا، کبھی جرعہ جرعہ ان سے قلب وذہن کو سراب کرنے کی کوشش کی، کبھی حیرتوں اور حسرتوں میں غوطہ زن ہوا، گاہے بلند قامت علماء کے علم وتقوی کا تمنائی بنا، بارے اپنی ناکامیوں اور تہی دستیوں پر ماتم کیا۔''

یہ سچ ہے کہ بھٹی صاحب جس مسلکِ حق کے پرچارک تھے اور جس عقیدے پر ایمان رکھتے تھے اس کی نشر واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اپنی محفل ہو یا غیروں کی، ہر اسٹیج ہر محفل اور ہر مقام پر مسلک اہل حدیث کی بھرپور وکالت کرتے رہے۔ میں اس کے ثبوت میں ان کی وہ تمام تصانیف پیش کرسکتا ہوں جو تقریباً پچاس ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں جن کی ایک طویل فہرست ہے لیکن وہ فہرست پیش کرنے سے بہتر ہے کہ مسلک حق کے دفاع میں ان کے چند اقوال پیش کردیے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

بھٹی صاحب اپنی کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' میں ان حضرات کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو کسی خاص مکتب فکر کے ترجمان اور شخصی تقلید کے منادہیں۔ بھٹی صاحب لکھتے ہیں:

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

قرآن، ص:۳۴۔۳۵۔۳۶، ''گزر گئی گزران، ص:۲۶۳)

بھٹی صاحب ان حضرات کے لیے آئیڈیل ہیں جو کسی مصلحت یا مفاد کی خاطر اپنے مسلک کی قربانی دے دیتے ہیں اور دوسری جماعتوں میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ان سے منسلک ہو کر اپنا وجود ختم کر لیتے ہیں اور قرآن وحدیث کی بالادستی کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔ **اللھم وفقنا لما تحب و ترضی۔**

بھٹی صاحب جماعت مجاہدین کی پرزور الفاظ میں وکالت فرماتے ہیں اور ان کے بارے میں دوٹوک الفاظ میں یوں لکھتے ہیں:

''یہاں میں واضح لفظوں میں عرض کروں گا کہ برصغیر کی آزادی میں سب سے زیادہ جدوجہد کرنے اور جانی اور مالی قربانیاں دینے والی جماعت مجاہدین کی ہے جو خالص اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والوں کی جماعت تھی اور جس کی قیادت کی باگ ڈور حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید رائے بریلوی کے ہاتھوں میں تھی، ان پاک باز حضرات نے ۱۸۲۶ء میں انگریزی حکومت کے خلاف سلسلۂ جہاد شروع کیا تھا جو آزادئ برصغیر ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔ اس جماعت نے ایک سو اکیس برس کی عمر پائی۔ برصغیر کی سب سے طویل عمر کی یہی جماعت مجاہدین ہے جس کے آثار اب بھی باقی ہیں اس کے بارے میں انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، انگریزوں نے بھی اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، اہل حدیث حضرات کا فرض ہے کہ وہ برصغیر کی آزادی کا کریڈٹ اسی جماعت مجاہدین کو دیں، دوسری کسی سیاسی اور اسلامی جماعت کو اس پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔'' (قافلۂ حدیث، ص:۴۹۸۔۴۹۹)

بھٹی صاحب کا مسلک اہل حدیث اور جماعت اہل حدیث سے قلبی لگاؤ اور بے مثال الفت ومحبت کا اندازہ لگائیے کہ وہ تاریخ کے صفحات سے اہل حدیث علماء اور جماعت اہل حدیث کی خدمات کو تلاش کر کے اور ان کو چن چن کر کس طرح حوالۂ قرطاس کرتے ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانی جماعت کے خلاف محاذ آرائی کے سلسلے میں جماعت اہل حدیث اور اس کے علماء کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے، ان کی خدمات کا تذکرہ نہایت سنہرے الفاظ میں اپنے مخصوص انداز میں یوں کرتے ہیں:

''یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ:

۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ سب سے پہلے اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا اور اس پر اولین دستخط میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ثبت فرمائے تھے۔

۲۔ مرزا غلام احمد سے مناظرہ ومباحثہ کرنے کے لیے سب سے پہلے جو عالم قادیان گئے وہ اہل حدیث تھے اور ان کا اسم گرامی تھا، حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری، وہ ۱۱ر جولائی ۱۹۰۳ء کو قادیان گئے تھے اور مرزا صاحب ان کے مقابلے میں نہیں آئے تھے۔

۳۔ فاتح قادیان کا خطاب ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کو دیا گیا۔

۴۔ مرزا صاحب کی موت کا باعث بھی مولانا ثناء اللہ صاحب ہوئے۔

۵۔ مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ سب سے پہلے اہل حدیث نے کیا۔ ۱۹۵۰ء میں اس موضوع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں مضامین لکھے اور اس پر زور دیا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں خود مرزائیوں کو چاہیے کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ انہیں اقلیت کا درجہ دیا جائے اس ملک کے آئین میں یہی صورت ان کے لیے فائدہ مند ہوگی۔

مرزائیت کے سلسلے میں اہل حدیث کی بہت سی اولیات ہیں، افسوس ہے موجودہ اکابر کو ان امور سے دلچسپی نہیں رہی اور وہ بھول گئے کہ ان کے اکابر نے اس میدان میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں۔'' (قافلۂ حدیث، ص:۵۰۶۔۵۰۷)

بھٹی صاحب کی تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، قادیانی اور بریلوی مکتب فکر اور شیعہ حضرات کے بارے میں بہت ساری تحریریں ہیں

اور ہر تحریر میں مسلک اہل حدیث کی حقانیت کی دلیلیں دی گئی ہیں ان تمام تحریروں کو یکجا کرنا امر دشوار ہے اس لیے انہیں چند اقوال واقتباسات پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

بھٹی صاحب کی عظیم شخصیت کے بارے میں کیا کہوں اور کیا لکھوں بس اتنا ہی عرض کرنا کافی ہوگا کہ:

انہیں کے دم سے فروزاں ہیں ملتوں کے چراغ
زمانہ صحبتِ اربابِ فن کو ترسے گا
(ناصر)

۱۹۸۴ء کی بات ہے میں نے پاکستان کا سفر کیا تھا اور اس سفر میں کئی بزرگوں سے ملاقات ہوئی تھی جن میں مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ مگر افسوس ان سے ایک سرسری ملاقات تھی، میں فلسفئ زماں، متکلم اسلام اور مفکر ملت وجماعت حضرت مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ سے محو گفتگو تھا کہ اسی دوران مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ بھی آئے تھے، ان سے ایک سرسری ملاقات اور تعارف ہوا اور فوراً ہی وہ کسی پروگرام کے تحت کہیں چلے گئے پھر دوبارہ ملاقات بھی نہ ہو سکی، البتہ دبئی آنے کے بعد فون پر کئی بار بات چیت ہوئی، کچھ علمی گفتگو اور خیر وعافیت پوچھ کر بات ختم ہو

جاتی تھی، کئی بار دوستوں نے پروگرام بنایا کہ بھٹی صاحب کو دبئی بلوایا جائے مگر حالات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ یہ پروگرام مرتب نہ ہوسکا، ہاں ۲۰۰۶ء میں انھوں نے اپنی ایک کتاب ''صوفی محمد عبداللہ، حالات، خدمات، آثار'' اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے دبئی کے پتہ پر ہدیۃً روانہ فرمایا، جس پر ۲۰۰۶/۶/۶ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہے کہ میرے ایک بڑے بزرگ نے اپنے قلم سے لکھ کر مجھے کتاب ہدیہ فرمایا، اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ آمین

میں نے یہ چند سطور عزیز القدر عبدالقدیر عبدالعزیز سلفی سلمہ اللہ کی خواہش کی تکمیل میں بعجلت لکھ دیا ہے تاکہ میرا بھی شمار ان کے چاہنے والوں میں ہو جائے۔ بھٹی صاحب کی عام زندگی کے بارے میں ان کے دیرینہ اور بے تکلف دوست پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ نے ان کی آپ بیتی ''گزر گئی گزران'' کے مقدمہ میں بہت ہی عمدہ تبصرہ فرمایا ہے، میں انہی کے الفاظ کے ساتھ اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ کے الفاظ:

''اس کے مزاج کی سادگی کو دیکھیے تو قرون اولی کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی ہے، ان کی سچائی اور صداقت شعاری کی روش کا جائزہ لیں تو ان کی پاک نفسی اور شخصیت کے اجلے پن کا اندازہ ہوتا ہے نہ لباس کی تراش خراش کا خیال اور نہ لب و لہجے کی مصنوعی اداؤں سے کوئی تعلق، بس اخلاص و وفا کا مجسمہ، محبت و اخوت کا پیکر، ایثار و ہمدردی کی تصویر، سادگی اور قناعت کا خوگر اور علم و قلم کی دولت سے مالا مال شخص کہ جس سے ایک بار مل لو تو بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔'' (گزر گئی گزران، ص:۱۸)

بھٹی صاحب کی اصلی شکل وصورت یہی تھی جو پروفیسر شاکر رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے، اللہ ان دونوں بزرگوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ آمین

جس طرح بھٹی صاحب میں کتاب وسنت کی تڑپ موجود تھی اور اس کے دفاع میں قلم کو عمر بھر رواں دواں رکھا اور مسلک حق کی وکالت کرتے رہے، یہ مختصر سا تعارف، مشہور مصنف، معروف مترجم، نامور صحافی، عظیم تاریخ نویس، بے مثال خاکہ نگار علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کا ہے۔ **اللھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه وادخله فی جنت الفردوس۔** آمین

آیئے اب ہم سب ملک کر دعا کریں، کہ اللہ ہمیں بھی توفیق دے کہ دین متین اور مسلک حق کی خدمت میں اپنا کچھ وقت اخلاص کے ساتھ لگا سکیں۔

مرنے والا اہلِ محفل کو تو گو تڑپا گیا
لیکن اہل بزم کو درسِ وفا سکھلا گیا
(علیم)

☆☆☆

**(ص:۵۶/ کا بقیہ)** حقیقت یہ ہے کتنے ہی گمنام لوگ تھے جن کو بھٹی صاحب کے قلم نے تابندگی و درخشندگی عطا کر دی ہے۔

ہمارے محترم ضیاء اللہ کھوکر، جو پیپلز پارٹی کے ادوار میں اعلی ایوانوں میں رسم و راہ رکھتے تھے، وہ بھی بھٹی صاحب کے مداح ہیں، زرداری صاحب کے دور صدارت میں مجھے کہنے لگے خواہش ہے کہ بھٹی صاحب کو صدارتی ایوارڈ مل جائے، چنانچہ میں نے اس غرض سے پاکستان کے میگزین زندگی میں بھٹی صاحب کی تصنیفات پر ایک مفصل مضمون لکھا جو ٹائٹل اسٹوری کے طور پر شائع ہوا، (شاید اب پھر قندِ مکرر کے طور پر شائع ہو جائے) اس سے ان کی علمی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود بھی (کسر نفسی) اپنی سوانح عمری، آپ بیتی کے طور پر ''گزر گئی گزران'' کے نام سے لکھ چکے ہیں۔

ہمارے ادارے سے ان کا ایک تعلق تھا، ہمارے ادارے کے کئی لوگ بھی ان پر مضمون لکھ چکے ہیں، وہ خود بھی فرمایا کرتے تھے: خاکہ نویسی کی طرف مجھے مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے دھکیلا تھا اور ابتدائی طور پر میں نے قومی ڈائجسٹ میں (شخصیات پر) لکھا تھا۔

میں اگرچہ ایک بہت چھوٹا آدمی ہوں، پھر بھی میرے لیے بھٹی صاحب ایک بزرگ، ایک مربی اور ایک بے تکلف دوست کی طرح تھے، وہ اتنے بڑے تھے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کوئی اپنے آپ کو چھوٹا نہ سمجھتا تھا، میں نے تو ان کے ساتھ بعض طویل سفر کرنے کی سعادت بھی حاصل کر رکھی ہے۔ کہتے ہیں ناں! ''کہ راہ پیا جانے یا واہ پیا جانے۔'' میں نے تو سفر کی تنہائی میں بھی اور معاملات کی یکتائی میں بھی انہیں ہر حال میں مخلص، دردمند اور بے غرض ہی پایا۔ ان کے دل میں ہر ایک کے لیے خیر ہی خیر تھی۔ خیر نہ ہوتی تو آج کے کینہ و نفرت کے دور میں جب کہ کوئی کسی کے لیے ایک کلمہ خیر کہنے کو تیار نہیں ہوتا، وہ دوسروں پر اتنا زیادہ ادر ادھر ادھر کیوں لکھتے چلے جاتے۔

کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ تحریک آزادی کے سپاہی بھی تھے اور جیل یاترا بھی کر چکے تھے، بھارت کے سابق صدر گیانی ذیل سنگھ جب ریاستوں کی پرجا منڈل کے پردھان تھے تو مولانا محمد اسحاق بھٹی سیکریٹری تھے اور ہندی ریاستوں میں انگریز مخالف سیاست کی پاداش میں قید و جبر برداشت کر چکے تھے۔

(گیانی ذیل سنگھ جب بھارتی صدر بنے تو اپنے اس دوست اور ساتھی کو بھارت یاترا کی دعوت دی مگر مولانا کی درویشی اور بے لوثی آڑے آ گئی، آخر عمر میں ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے آبائی شہر فرید کوٹ کو دیکھ آئیں، مولانا عبدالوہاب خلجی نے بہت کوشش کی مگر افسوس بھارتی سفارت خانہ نے ۸۶ سال کے بوڑھے کو ویزا دینے سے انکار کر دیا)

☆☆☆

# رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حافظ احمد شاکر (مدیر الاعتصام، لاہور)

لیجیے ہمارے بھٹی صاحب یعنی مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی اس دیس چلے گئے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ جنھیں قلم اب تک حفظہ اللہ لکھتا رہا اب وہی قلم رحمہ اللہ لکھنے پر مجبور ہوگیا، بلکہ جب تک قلم چلے گا اس پر ان کا نام آتا رہے گا تو رحمہ اللہ ہی انھیں لکھنا پڑے گا۔ إن للہ ما أخذ و لہ ما أعطی و کل شیء عندہ بأجلٍ مسمی. ولا نقول إلا مایُرضی بہ ربّنا، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون. إنا بفراقک یا إسحاق لمحزونون.

بھٹی صاحب اپنی ولادت ۱۵ر مارچ ۱۹۲۵ء بتلایا کرتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں والد صاحب ان کے گاؤں کوٹ کپورہ میں بحیثیت خطیب و مدرس گئے تھے، والد صاحب کا انھی دنوں نکاح ہوا تھا اور والدہ مرحومہ کو کوٹ کپورہ میں لے کر آئے تھے۔ میرے تایا مولانا قاری حافظ محمد عبداللہ بھوجیانی ان سے بھی پہلے وہاں امام تھے، میرے تایا کے گھر میری خالہ تھیں، لہٰذا والدہ بھی بہن کے پاس ہی آگئیں، اس وقت بھٹی صاحب کی عمر آٹھ سال کے لگ ہوگی، اس عمر میں ان کے دادا والد گرامی مولانا محمد عطاء اللہ کے پاس تعلیم کے لیے چھوڑ گئے۔ حضرت والد صاحب کے پاس انھوں نے جملہ عقلی ونقلی علوم وفنون کی ہر کتاب اول سے آخر تک ان سے پڑھی۔ پھر والد صاحب کے فرمانے پر ہی وہ گوجرانوالا میں حضرت مولانا حافظ محمد گوندلویؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں بقایا علوم کی تکمیل کے لیے گئے۔ فراغت کے بعد ایک سال تک سرکاری ملازمت کی پھر ''جامعہ محمدیہ لکھو'' کے میں قیام پاکستان تک تدریسی فرائض انجام دیتے رہے۔

وطن سے ہجرت کرکے پاکستان ضلع فیصل آباد آکر کاشت کاری کرنے لگے۔ انھی دنوں وہ کچھ عرصہ جامعہ محمدیہ اوکاڑا میں اپنے دوست چودھری غلام حسین تہاڑیہ کے ساتھ مقیم بھی رہے۔ پھر چک نمبر ۵۳ رگ ب میں آکر کاشت کاری کرنے لگے کہ ان کے استاذ گرامی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف انھیں گاؤں سے لے آئے اور مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا ان کو اولاً ناظم دفتر بنادیا، بعد میں گوجرانوالہ سے مولانا محمد حنیف ندوی کے زیر ادارت نکلنے والے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کا نائب ایڈیٹر انھیں مقرر کردیا، جہاں گاہے گاہے وہ شذرات بھی لکھتے رہے۔

حضرت والد صاحب تو کوٹ کپورہ سے فیروز پور آگئے، لیکن میری ولادت رمضان ۱۳۶۳ھ، ۱۹۴۴ء میں کوٹ کپورہ میں ہی ہوئی اور عقیقہ بھی وہیں اور میرے عقیقے میں شریک وہ واحد شخصیت زندہ تھی۔ اب اس نہج سے دیکھا جائے تو میرا بھٹی صاحب سے تعلق کس قدر قدیم اور گہرا تھا، لہٰذا میرے جذبات کی کیفیت یقیناً ان کے نیازمندوں سے مختلف ہونی چاہیے اور مختلف ہے۔

درمیان کے بعض ناخوش گوار حالات کے باوجود ہمارے گھر اور خاندان (ننھیال اور ددھیال) سے وہ خوب آشنا تھے۔ جن کی خیر خیرت وہ ہمیشہ دریافت کرتے رہے۔ مولانا بھٹی اب تو ایک تذکرہ نگار اور خاکہ نویس کی حیثیت سے معروف ہوگئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شہرت صرف ان کے ایک فن کی تھی۔ مولانا درس نظامی کے ایک فاضل ہی نہ تھے بلکہ لکھوکی میں درس نظامی کی تدریس بھی کرتے رہے۔ مولانا حنیف ندویؒ کے ادارہ ثقافت میں جانے کے بعد پھر ۱۵ر سال تک ''الاعتصام'' کا اداریہ، جو درحقیقت ملک کے تازہ ترین سیاسی حالات کی تجزیہ نگاری ہوتی ہے، بھی لکھتے رہے۔ کتابوں پر تبصرے، آمدہ مضامین کی ترتیب وتدوین اور دنیا بھر کی خبروں کا واقعات عالم کے نام سے انتخاب بھی ایک مستقل عنوان تھا۔ اس کے علاوہ جماعت کی تنظیم، اس کے سیاسی موقف اور قائدین کی تبلیغی وسیاسی خدمات کے ساتھ ساتھ جماعتی خبروں کا ایک مستقل صفحہ بھی ترتیب دیتے رہے گویا صحافت کے سارے میدانوں کے وہ شہسوار تھے۔ صحافت کی مختلف اقسام ہوتی ہیں، روزانہ، سہ روزہ، ہفتہ وار، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ الاعتصام ان کی ہفتہ روزہ صحافت کا آئینہ دار تھا، سہ روزہ صحافت کا تجربہ انھوں نے اپنے ذاتی جریدے ''منہاج'' پر کیا تھا اور ماہنامہ ''المعارف'' کی کئی سال تک انھوں نے ادارت کی ذمہ داری ادا کرکے اپنی صلاحیت کا لوہا منوالیا تھا۔ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھے جس کی سب سے بڑی دلیل فہرست ابن ندیم، ارمغان حدیث اور پھر ریاض الصالحین کے تراجم ہیں، ان کی شان تحقیق کے لیے برصغیر میں علم فقہ، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، ''اہل حدیث کی اولیات'' اور تیرہ صدیوں تک ''فقہائے ہند'' کا ۱۰ر جلدوں کا تذکرہ ایسے شواہد ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ باقی رہی تذکار نویسی تو وہ ان کا ایک ایسا فن ہے جو پورے عالم پر آشکار ہے۔ خصوصاً ان کا مجموعہ ''ہفت اقلیم'' ان کے شاہکار خاکے ہیں کیوں کہ وہ جو بات کہنا جانتے تھے ان کا اسلوب اور طریقۂ اظہار سہل ممتنع کی ایک عمدہ مثال تھا اور واقعتاً

ان کی ''کتابوں'' میں گلوں کی خوشبو ان کے لہجہ میں ادب کا تیور

اکثر ہوتے تھے، لیکن کبھی کبھی ان کا قلم مورخ بھی بن جاتا تھا، لیکن بہت کم اور یہ اس لیے کہ مذکورہ شخصیت کا کوئی پہلو اوجھل نہ رہے۔

بھٹی صاحب کے دادا نے ان کی دینی تربیت اس اخلاص واہتمام سے کی کہ زندگی کے گردش ایام میں پھسلن کے کئی پہلو آنے کے باوجود فرائض کے ساتھ ساتھ

سحر خیزی کی عادت بھی ان کی آخر تک قائم رہی۔ فجر سے قبل اٹھ کر وہ باقاعدگی سے تلاوت قرآن کرتے، ایسے ہی رمضان المبارک میں.... قریب مسجد نہ ہونے کے باعث.... اپنے گھر میں تراویح کا باقاعدہ اہتمام کرتے، اولاً مختلف حفاظ سے تراویح میں قرآن کریم سنتے اور جب سے ماشاء اللہ ان کے بھتیجے حافظ حسان سلمہ اللہ حفظ قرآن کی نعمت سے سرفراز ہوئے ان سے تراویح پڑھواتے۔

اسی طرح جن افراد یا اداروں سے انھوں نے فیض پایا ان کا تذکرہ و اعتراف وہ ہمیشہ کرتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا امرتسری رحمہم اللہ ہمیشہ ان کی عقیدت کا مرجع رہے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو انھوں نے نشان راہ بنایا۔ اساتذہ سے استفادے کا ذکر بھی وہ ہمیشہ کرتے رہے، چنانچہ ان کا کوئی بھی خصوصاً سوانحی مضمون مولانا عطاء اللہ حنیف اور ''الاعتصام'' کے تذکرے کے بغیر مکمل نہ ہوتا تھا۔ حضرت مولانا حافظ محمد بھٹوی کو بھی اپنا استاد اس لیے کہتے کہ انھوں نے ''صرف بہائی'' کا ایک سبق ان سے پڑھا تھا۔ اسی طرح اپنے دوست احباب کو بھی ہمیشہ یاد رکھتے اور ان سے رابطہ رکھتے خصوصاً نظریاتی احباب سے تو وہ ہمیشہ رابطے میں رہتے اور جب کسی سے ملاقات ہوتی تو ان کے ذہن پر مرتسم سب یادیں متحضر ہو جاتیں جن کے ذکر سے وہ ماضی میں لوٹ جاتے اور ہم دم دیرینہ کی ملاقات ان کو تازہ دم کر دیتی۔

بھٹی صاحب سیاسی و فقہی لحاظ سے ایک نظریاتی شخص تھے، انھوں نے نہ کبھی سیاسی نظریات میں مصالحت سے کام لیا تھا اور نہ ہی کبھی ان کے مسلکی تصلب میں کمی آئی تھی۔ سب انسانوں کی طرح ان پر عملی کمزوریوں کے کئی ادوار بھی آئے ہوں گے لیکن مسلک اہل حدیث پر ان کا رویہ کبھی بھی مدافعانہ نہیں رہا۔

بھٹی صاحب عالی دماغ تو تھے ہی، حاضر دماغ اور بالغ نظر بھی تھے۔ بھٹی صاحب جہاں دیدہ، سرد و گرم چشیدہ اور اصحاب علم و فضل سے فیض یاب اور غیر معمولی برداشت سے بہرور تھے۔ ہر مخاطب سے اس کی سطح پر آ کر گفتگو اس طرح فرماتے کہ مخاطب نہال ہو جاتا اور بھٹی صاحب سے اپنا تعلق خصوصی محسوس کرتا۔ وہ غایت درجہ متواضع اور منکسر المزاج بھی تھے۔ ان کا ذاتی عمل اور دین کی دعوت ''الدین یسر'' کا اظہار ہوتا تھا۔ اور ان کا صدقہ جاریہ ہے کہ انھوں نے بعض احباب کو ترجمہ قرآن بھی باقاعدہ پڑھایا۔ اور دین کی تعلیم کی خدمت انھوں نے دنیاوی مفادات سے ماورا ہو کر کی۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی نے کویت، سوڈان، امارات اور بعض سعودی طلباء و علماء کو سند حدیث بھی عطا کی، جس سے اللہ تعالیٰ نے بھٹی صاحب کو سلسلۃ الذہب میں غیر متوقع طور پر شمولیت سے بہرہ ور کر دیا۔ اپنے مقالات و مضامین میں وہ قرآن حکیم کی آیات کا ترجمہ خود نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ متقدمین میں سے شاہ عبدالقادر اور اکثر مولانا فتح محمد جالندھری کا ترجمہ نقل کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ قرآن مجید کا ترجمہ بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔

بہت ہی کم احباب جانتے ہوں گے کہ کسی زمانے میں مولانا بھٹی کچھ عرصہ مستقل طور پر، پھر گاہے گاہے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطبہ بھی دیتے رہے۔ اب تو کچھ عرصہ سے وہ بعض مجالس خصوصاً اپنے اعزاز میں منعقدہ تقریبات میں باقاعدہ خطاب کرنے لگے تھے جو ان کی کتابوں کی طرح عام فہم اور بے تکلفانہ ہوتا تھا۔

مولانا بھٹی رحمہ اللہ کا مطالعہ غیر معمولی وسیع اور متنوع تھا۔ پنجابی زبان کے اشعار، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں بھی ان کو بہت یاد تھیں، جن کا اپنے برخورداروں میں بعض مرتبہ بے تکلفانہ اظہار بھی کرتے، بلکہ انھوں نے خود بتایا کہ ''روزنامہ امروز'' جس میں ان کے مضامین و مقالات بہ کثرت شائع ہوتے تھے کے ایڈیٹر ظہیر بابر سے ملنے گئے تو ان کے کہنے پر بیٹھے بیٹھے پنجابی محاوروں اور کہاوتوں پر ایک مضمون لکھ دیا۔ بھٹی صاحب کے پاس جو کتاب آتی یا جو رسائل آتے وہ ان سب کا باقاعدہ اور کم و بیش اول سے آخر تک مطالعہ کرتے اور ہم خوردوں کو اس پر ڈانٹتے کہ تم لوگ مطالعہ نہیں کرتے، گویا اگر یہ کہا جائے کہ مولانا اسحاق بھٹی صاحب عربی، اردو، فارسی اور پنجابی ان سب زبانوں سے آشنا ہی نہیں ان کے شناور بھی تھے تو بات غلط نہ ہوگی۔ اسی طرح بھٹی صاحب آمدہ خطوط کے جواب بہت باقاعدگی سے دیتے اور جب سے ٹیلی فون کی سہولت عام ہوئی ہے تب وہ دور دراز شہروں اور بیرون ممالک کے ملنے والوں سے باقاعدہ رابطہ رکھتے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی کی عمر ماشاء اللہ دراز تھی اور مجموعی طور پر ان کی صحت قابلِ رشک رہی کہ وہ غذا ہمیشہ سادہ اور کم کھاتے، جب تک صحت نے ساتھ دیا پیدل بھی خوب چلے اور سواری ان کے پاس زیادہ سے زیادہ سائیکل رہی، عام لوگوں کی طرح ہم بھی حیران ہوتے کہ مولانا بھٹی صاحب خطوط کے جواب، دوست احباب کی مجالس میں شرکت، مختلف طبقات کی میٹنگوں میں جانا اور ملک و بیرون ملک کے مختلف اسفار بھی کرتے رہتے اور سب کی طرح ان کی بھی روزمرہ کی مصروفیات تھیں لیکن اس کے باوجود اتنا تحریری کام وہ کیسے کر گئے؟ میری معلومات اور رائے کے مطابق یہ برکت ان کے حوصلہ کے باعث تھی، بھٹی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا کیں وہ انھوں نے ترجیحاً اپنے بہن بھائیوں پر نچھاور کر دیں۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ بنایا ہو، کم از کم میرے علم میں نہیں۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور ان کی اولاد کی ممکن حد تک پرورش بھی کی، تربیت بھی کی، ان کی زندگی کے استحکام کا خیال بھی رکھا، ان کے بچوں کی عائلی زندگی کو استوار بھی کیا اور ان کے لیے شجر سایہ دار اس طرح بن کر رہے کہ خود دھوپ جھیل کر ان کو سایہ دیتے رہے۔ بہن بھائیوں کے علاوہ دیگر عزیز و اقارب سے بھی حسن سلوک مثالی تھا اور یہ ایک

ایسی صفت ہے جس سے زندگی میں برکت آتی ہے اور مولانا بھٹی صاحب کی زندگی کی علمی وعملی برکت تو ایک عالم پر آشکار ہے، اب ان کے لیے دعائے مغفرت کے ڈھیر بھی ایسی برکت ہے جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ نعمت کسی ہوتی ہے، ؏ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی طرح ہر کسی کے ساتھ بھٹی صاحب کی تواضع اور انکسار بھی مثالی تھا، ہم عصر علماء، برخوردار علماء بلکہ ہم جیسے تمام برخورداروں کے ساتھ ان کا انکسار دیدنی ہوتا تھا۔ المکتبۃ السلفیۃ نے ان کی تصنیف ''قاضی سلیمان منصور پوری'' طبع کی تھی، ٹائٹل پر ہم نے مولانا (جونا شرین میں سے شاید ہم نے ہی شروع کیا تھا) محمد اسحاق بھٹی لکھ کر دکھایا تھا تو انھوں نے لفظ مولانا کاٹ دیا، جب ہم نے اصرار کیا تو فرمانے لگے کہ قاضی صاحب کی سوانح پر مولانا لکھوانے پر طبیعت آمادہ نہیں لہٰذا اس کو کاٹ کر صرف ''محمد اسحاق بھٹی'' لکھو۔

دوسرے مصنفین و مولفین کی صلاحیتوں، صفات اور خوبیوں کا اعتراف بھی وہ کھلے دل سے کرتے، جب انھوں نے روپڑی علماء پر کتاب لکھی تو حافظ محمد عبداللہ روپڑی کے تفقہ اور اردو زبان پر ان کی دسترس کا ذکر اکثر فرماتے اور یہ کتاب لکھ کر بہت مسرور ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اس کے بعد ہی انھوں نے لکھوی خاندان کے بکھرے حالات جمع کر کے لکھنے کا ارادہ کیا، پھر ڈاکٹر حماد لکھوی حفظہ اللہ کے توسط سے ان کے برادران اور خاندان کے بعض حالات میسر ہو گئے تو مولانا محی الدین لکھوی پر ایک ایسی کتاب لکھ دی جس میں حتی الامکان لکھوی خاندان کے اکثر حالات وہ ضمناً لے آئے، مولانا معین الدین لکھوی پر بھی ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ وہ لکھوی خاندان کی صالحیت، ذہانت، بیدار مغزی اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھے۔

علمائے غزنویہ ان کی عقیدت کا مرجع تھے کہ انھیں ایک طویل عرصہ حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کے قرب کا شرف حاصل رہا اور ان کی جلوت میں خدمت گزاری سے بھی وہ بہرہ ور ہوئے۔ اس لیے اب وہ علمائے غزنویہ پر بہت نادر معلومات سمیٹے ہوئے ایک کتاب لکھ رہے تھے، بلکہ لکھ چکے تھے کہ کتاب اختتام کے قریب پہنچ چکی ہے، جسے طبع کرنے کی خواہش کا راقم نے جب اظہار کیا تو انھوں نے از راہ شفقت وعدہ بھی فرما لیا تھا۔

تنظیمی لحاظ سے مولانا محمد اسحاق بھٹی کی نہ صرف ہمدردیاں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ساتھ رہیں بلکہ ''برصغیر میں اہل حدیث کی سرگزشت'' لکھ کر اہل حدیث کی صد سالہ تاریخ بھی انھوں نے تحریر کر دی اور ساتھ ہی پاکستان میں منعقدہ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی تمام کانفرنسوں کے ''خطبات استقبالیہ اور صدارت'' تلاش کر کے ترتیب دے دیے یہ دونوں غیر ثمر آور کتب کی اشاعت کی سعادت بحمد اللہ المکتبۃ السلفیہ کے حصے میں آئی۔

قارئین تو صرف پڑھ کر داد ہی وہ بھی کوئی کوئی دینا جانتے یا داد دیتے تھے، لیکن مرحومین علماء کے حالات جمع کرنا اور مذکورہ علماء کے ورثاء اور تلامذہ کی عدم دلچسپی اور ان کی بے اعتنائی سے بھگتنا بھی اس قدر جاں گسل مرحلہ ہوتا ہے کہ بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے، لیکن مولانا مرحوم خط و کتابت، ٹیلی فون اور ایک نہیں کئی کئی ملاقاتیں کر کے وہ جگر لخت لخت جمع کرتے، تب کہیں کتاب تیار ہوتی۔

اور تو کسی کا پتہ نہیں، بھٹی صاحب ہم خوردوں کی کوتاہیوں پر شفقت بھری سرزنش بھی فرماتے رہے، جس میں ان کا بنیادی ارشاد یہ ہوتا تھا کہ تم تازہ ترین اخبارات و جرائد نہیں پڑھتے، وہ فرماتے کہ ایڈیٹر کا کام تمام آمدہ رسائل و جرائد کو باقاعدگی سے پڑھنا ہوتا ہے، جس سے عالمی حالات، مسلم امہ کے احوال اور وطن عزیز کی تازہ ترین صورت حال علم میں آجاتی ہے اور صحافت کی بنیاد یہی ہوتی ہے۔ ایسے فقہی مسائل پر مختلف مکاتب فکر کی آراء کا ادراک کر کے ادارے کی پالیسی پر لکھنا چاہیے۔ ایسے کم از کم میری (تحریر) زبان کی اصلاح بہت فرماتے، خصوصاً اظہار میں متانت اور اپنے جریدے کا وقار ملحوظ رکھنے کی ہدایت اکثر فرماتے۔ بھٹی صاحب نے خود بہت پڑھا، خوب پڑھا اور متنوع مطالعہ کیا، اپنے پاس آنے والی کتابوں کے علاوہ کوئی پسندیدہ کتاب جب مل جاتی تو وہ کتاب کو اول سے آخر تک پڑھتے اور ہر کتاب کو موافق مخالف کو اول سے آخر تک پڑھنے کا نام ہی اصل مطالعہ ہوتا جس کے بھٹی صاحب خوگر تھے،

اک شخص کیا گیا کہ بھرا شہر دفعتاً — بے حوصلہ و بد دل و کم کوش ہو گیا
اک شخص ٹوکتا تھا بہت اہل شہر کو — مژدہ کہ آج رات وہ خاموش ہو گیا

آہ! ۱۹۲۵ء کے موسم بہار میں کھلنے والے پھول کو ۲۰۱۵ء کی خزاں ہم سے چھین لے گئی۔

اس وقت کریں گے یاد رونے والے
جن دن نہ ''اسحاق'' انجمن میں ہوگا

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ریٹائرمنٹ کے بعد بیرون ملک مقیم اہل علم کی بعض نیازمندوں نے ذاتی مفاد سے بالا ہو کر نہایت اخلاص، عقیدت سے ان کی خدمت اس طرح اور اس حد تک کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غم روزگار سے آزاد کر دیا۔ ہماری دعا ہے کہ بھٹی صاحب کی خصوصاً سوانحی خدمات کے اجر میں اللہ تعالیٰ ان احباب اور نیازمندوں کو بھی شریک اجر و ثواب کرے۔ جزاھم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے اور جماعت کو ان کا نعم البدل دے، کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

☆☆☆

# مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ: نقوش وتأثرات

مولانا عبدالرشید عراقی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام اے ساقی

**فما كان قيس هلكه هلك واحد**
**ولكنه بنيان قوم تهدما**

(قیس کی موت تنہا کسی ایک آدمی کی موت نہیں اس کے مرنے سے تو پوری قوم کی عمارت گر پڑی۔)

میں دیکھتا ہوں کہ زمین کی آبادیاں جوں کی توں قائم ہیں اور دوست ہیں کہ چلے جارہے ہیں۔ دوستو! موت کے سوا کوئی اور مصیبت ہوتی تو اس کا گلہ اور چارہ سازی بھی ہوتی، موت پر کیا گلہ، علمی حلقوں میں بالعموم اور جماعت اہل حدیث کے لیے بالخصوص یہ خبر نہایت غمگین ہوگی کہ مؤرخ جماعت اہل حدیث، نامور صحافی، صاحب تصانیف کثیر، بلند پایہ ادیب ونقاد، دینی راہنما اور صاحب تحقیق وتدقیق، میدان تحریر وتقریر کے شہسوار حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء کو اس دنیائے فانی سے دار آخرت کی طرف روانہ ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

موت سے کسی کو مفر نہیں، لیکن جو لوگ ملی مقاصد کی تائید وحصول میں تادم آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں ان کی وفات قبل از وقت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ (گنجہائے گرانمایہ)

حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی پر یہ جملہ مکمل طور پر صادق آتا ہے۔ بھٹی صاحب نے اپنی زندگی جماعت اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث کی اشاعت اور قرآن و حدیث کی مدافعت ونصرت وحمایت وتائید میں وقف کردی تھی۔

آدمی کا مرنا اس آسمان کے نیچے کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، کوئی اچنبھے کی بات نہیں، بچے مرتے ہیں، بوڑھے مرتے ہیں، جوان مرتے ہیں، موت ہر شہر اور گاؤں میں ہر آن زندگی کے ہاتھوں سے خراج وصول کرتی ملتی ہے۔ گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت۔ لیکن کئی طرح کے جینے والے ہیں اور کئی طرح کے مرنے والے ہیں۔

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو  عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

۲۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء کی سوگوار صبح مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ میں قرآن مجید کی تلاوت سے فارغ ہوکر لیٹا ہی تھا کہ مولانا رمضان یوسف سلفی صاحب کا فیصل آباد سے فون آیا کہ:

مولانا محمد اسحاق بھٹی اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ ۲ر بجے بعد دوپہر ناصر باغ لاہور میں جنازہ ہوگا اور رات ۸ر بجے ان کے گاؤں چک ڈھیسیاں فیصل آباد میں دوسرا جنازہ ہوگا۔ اور پھر ان کی وہاں تدفین ہوگی۔

ایک ہمدم دیرینہ دوست کی خبر وفات سن کر دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں اور زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون جاری ہوگیا۔ سانحہ موت کی خبر عموماً تکلیف دہ ہوتی ہے مگر مولانا محمد اسحاق بھٹی جیسے رفیق ودوست کی موت کی خبر صدمہ جانکاہ تھی، دل کو شدید دھچکا لگا۔

سب سے پہلے مولانا ابوعمر عبدالعزیز سیال صاحب کو اطلاع دی، اس کے بعد پروفیسر حافظ عبدالستار حامد صاحب اور حکیم عتیق الرحمٰن آگ الٰہ آباد کو بذریعہ فون اطلاع دی سب ہی بے چین ہوگئے، محترم بھٹی صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کے لیے وقف کردی تھی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق  ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی وفات بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند سے تاریخ اہل حدیث مکمل طور پر واقف کار اور عبور کامل کا حامل اور دین اسلام کا مبلغ مسلک اہل حدیث کا شیدائی اور قرآن وحدیث کا دفاع کرنے والے مجاہد کی کمی ہوگئی ہے۔ تاریخ اسلام کا حافظ ایک دیدہ ور مورخ رخصت ہوگیا۔ علمائے اہل حدیث میں سے ایک بلند عالم محقق، مؤرخ، ادیب، نقاد، نثر نگار، وانشور، صحافی، مصنف، مقرر اور مبلغ ہم سے جدا ہوگیا اور اک شمع فروزاں گل ہوگئی۔

مولانا بھٹی صاحب مؤرخ محقق اور ماہر شخصیات ہی نہ تھے بلکہ ایک جید عالم دین اور علوم اسلامیہ کے متبحر عالم تھے۔ انہیں تمام علوم عالیہ وآلیہ پر یکساں قدرت حاصل تھی مولانا بھٹی صاحب کا خاص موضوع شخصیات تھا۔ وقت کی تمام علمی، دینی و ملی اور سیاسی تحریکیوں میں حصہ لیا۔ ابتدا ہی سے آل انڈیا کانگریس سے وابستہ رہے اور اسیر زنداں بھی رہے۔

علمی خوبیوں کے ساتھ ساتھ نہایت محبوب شخصیت رکھتے تھے جس دوست سے ایک دفعہ ملے اسے گرویدہ بنالیا۔ مسلک اہل حدیث سے مرحوم کو بہت عقیدت اور محبت تھی۔ تمام زندگی اس مسلک کی اشاعت وتبلیغ اور مدافعت ونصرت اور حمایت وتائید میں کوشاں رہے اور مرحوم میں یہ خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی کہ مسلک اہل حدیث کی مخالفت میں معمولی سی مداہنت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، جب بھی کوئی شخص مسلک اہل حدیث کے خلاف لکھتا تھا سب سے پہلے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی اپنے دم سے ایک عہد تھے وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور

# مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی زندگی کے چند تابناک پہلو

مولانا راشد حسن سلفی مبارکپوری (نئی دہلی)

حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی ۲۲ دسمبر ۲۰۱۵ء کو اس دار فانی سے چل بسے، مولانا رحمہ اللہ نے ایک بھرپور زندگی گزاری، سیکڑوں اہل علم جو پردۂ خفا میں تھے ان کی سوانح عمری اور ان سے وابستہ یادیں لکھ کر انہیں زندگی بخشی، ہندو پاک کی سیاسی جماعتی، تمدنی اور علمی تاریخ لکھی، ان کے کارناموں کی فہرست طویل ہے، حضرت مولانا کی عظمت اس وقت ذہن ودماغ پر چھا جاتی ہے جب یہ خیال آتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ نہ کیا جاتا تو ہمارے پاس تاریخ وتراجم اور سیر وسوانح کے نام سے کیا چیز ہوتی، وہ سب بھی اس خوبصورت انداز اور لب ولہجے میں کہ قاری پڑھتا جائے اور لذت محسوس کرتا جائے تا آنکہ کتاب ختم کرلے، یہ سب کچھ انہیں اللہ تعالی کی جانب سے خصوصی اعزاز کے طور پر ملا، زندگی بھر جس صبر وضبط، قناعت وتوکل، نیکی وصالحیت اور پوری ایمانداری کے ساتھ کام کرتے رہے اس کی مثال ہمارے معاشرے میں ملنا نہایت مشکل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدایے بخشندہ

مولانا بھٹی کیا تھے، لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا، لکھتے بھی رہیں گے، لیکن ان کی زندگی کے بعض پہلو بہت زیادہ روشن ہیں، ایک آدمی بہت بڑا عالم بن جائے، بہت بڑا خطیب بن جائے، بہت بڑا مؤلف، مصنف اور قلمکار بن جائے کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات یہ ہے کہ وہ کتنا بڑا انسان ہے، اس کے اندر کی انسانیت کا گریٹ کس درجہ کا ہے، شرافت اور نیک نفسی کا پایہ کتنا بلند ہے، اگر یہ چیزیں ایک بڑے عالم کے اندر ہیں تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے بڑا کہا جائے، ورنہ محض خطابت، تالیف وتحقیق سے کوئی بڑا نہیں بنتا، بہت ممکن ہے وہ دنیا کی نظروں میں بڑا ہو مگر وہ خود اپنی نظروں میں بہت چھوٹا ہوتا ہے، کمال یہ ہے کہ آدمی اپنی نظر میں بھی بڑا بن جائے اور شریعت کی نظر میں بھی اپنی اہمیت کو منوالے۔ شرافت واعلی ظرفی بہت بڑی انسانی قدریں ہیں، اگر یہ کھوگئیں تو انسان کے پاس کچھ نہ بچا اور اگر یہ ہیں تو سمجھو سب کچھ ہے، مولانا بھٹی رحمہ اللہ کے یہاں یہ عنصر بہت اعلی درجے کا تھا، انہیں یہ صفت بہت پسند تھی، اس صفت سے متصف لوگوں کا بڑی فراخ دلی سے تذکرہ بھی کیا ہے۔

مولانا بھٹی نے اخبار ''الاعتصام'' کی پندرہ سالوں تک ادارت کی، حضرت مولانا داود غزنوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد حالات بدلے تو مجبوراً اخبار کی ادارت سے مستعفی ہونا پڑا، آٹھ مہینے مولانا کی تنخواہ رکی رہی لیکن اس کے باوجود مولانا اپنی زبان پہ حرف شکایت نہ لائے، مولانا اس اخبار کی بابت لکھتے ہیں:

''اخبار الاعتصام کو بھی نہیں بھول سکتا کہ میں نے اس سے اپنی تحریری زندگی کا آغاز کیا، اس کی توسیع واشاعت کے لیے بے حد محنت کی، ۵۱-۱۹۵۰ء میں نہ سڑکوں کا یہ سلسلہ تھا جو اب ہے، اور نہ موٹر لاریوں کی یہ کثرت تھی، جو اس دور میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں نے شدید گرمیوں میں دس دس بارہ بارہ کوس پیدل سفر کیا ہے، بھوک پیاس کی شدتیں برداشت کی ہیں، اخبار کے لیے جان لڑادی، جوانی کا بہترین زمانہ اس کی نذر کردیا، دن کو بھی اسی کا کام اور رات کو بھی یہی دھندا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کی ادارت سے مجھے الگ ہونا پڑا تو انتہائی ذہنی کوفت ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے اس کا کبھی ایک خریدار بھی نہیں بنایا تھا وہ اس کے مالک ومنتظم تھے اور جس نے دن رات محنت کی وہ بے بس اور مجبور تھا، میں اس اخبار سے الگ ہوگیا مگر اس کی محبت میرے دل سے نہیں نکلی''۔ (نقوش عظمت رفتہ/۲۲۸)

مولانا بھٹی نے اس اخبار کے لیے کس قدر جدوجہد کی، خود ہی مدیر تھے، ادارت کی دیگر مصروفیات کے دو بدو ٹکٹ لگا کر خود ہی بھیجتے تھے اور خود ہی اس کا خریدار بھی بناتے، خود ہی پروف ریڈنگ کرتے، مضمون کو قابل اشاعت بنانے کے لیے محنت کرتے، یہ ساری چیزیں پوری تندہی اور اخلاص سے کرتے رہے، معمولی مدت تک نہیں بلکہ پندرہ سالوں تک۔ ظاہر ہے جب اس سے الگ ہونا پڑا ہوگا اس وقت کلیجہ شق ہوگیا ہوگا، بہت تکلیف ہوئی ہوگی، مگر خوبصورتی سے الگ ہوگئے، نہ کوئی محاذ قائم کیا اور نہ کوئی جتھہ بندی، بلکہ حضرت مولانا اسماعیل سلفی گوجرانوالہ کے نام جو خط لکھا اس کے آخری جملے یہ تھے:

''میں ''الاعتصام'' کی ادارت سے مستعفی ہوتا ہوں مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا قلم مسلک اہل حدیث کی خدمت کے لیے ہمیشہ متحرک رہے گا۔''

(نقوش عظمت رفتہ/۲۲۲)

یہ اعلی ظرفی کی ایک زندہ مثال اور روشن نمونہ ہے، مشکل ترین حالات میں بھی اعلی ظرفی اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی تحریری زندگی کو تادم واپسیں اولوالعزمانہ ہمت وحوصلہ کے ساتھ جاری رکھا، اپنی تحریروں کو مختلف قسم کی حد بندیوں

سے دور رکھا، یہی وجہ ہے اپنے مسلک پر سختی سے کاربند رہنے کے باوجود دیگر مسالک کے لوگوں کا تذکرہ مستقل اور ضمنی طور پر جابجا کیا ہے، جس کے اندر بھی کمالات اور خوبیاں دیکھیں بھلے انداز میں تذکرہ کیا، اس ضمن میں اپنے ایک ہندو ''رفیق'' سابق صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کا بھی تذکرہ بڑے خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، ان کی تحریروں میں کہیں کسی طرح کا تعصب اور تنگ نظری نظر نہیں آتی، صاف دلی، صاف گوئی، دلکش لب ولہجہ، ستھرا ذوق ادب، شستہ طرز نگارش، لطافت کی رنگ آمیزی اور پرسکون روانی اس پر مستزاد۔ کہیں تیکھی زبان دیکھی تو اس پر مشفقانہ گرفت، حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ حدیث اور علم حدیث میں اس دور کے جلیل القدر عالم دین تھے، مگر حریف پر جب نقد کرتے تو زبان اور لب و لہجے میں سختی آجاتی، مولانا بھٹی نے ان پر بہت میٹھے انداز میں گرفت کی اور کہا کہ ہمارے اسلاف میں بہت بڑے بڑے اہل علم گزرے ہیں مگر اس طرح کی سخت زبان وہ ہرگز استعمال نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اپنے ایک خط میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری رحمہ اللہ کی بابت یہ جملے لکھے:

''قاضی اطہر نے ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' میں مولانا مبارکپوری کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جہالت کا ثبوت دیا ہے''، مزید آگے لکھا: ''اس طرز فہم سے اندیشہ ہے کہ ان صاحب نے مزید گل کھلائے ہوں گے، اس لیے ان سے استفادہ کرنا ہو تو ذرا بچ اور سنبھل کر''۔

مولانا بھٹی رحمہ اللہ نے اس پر بہت خوبصورت تبصرہ کیا ہے، وہ تبصرہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''مرحوم ومغفور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے قاضی اطہر مبارکپوری کی ''جہالت'' کے ثبوت میں جو مثالیں بیان فرمائی ہیں، یہ فقیر ان پر اظہار رائے نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ یہ گنہگار حضرت مبارکپوری رحمہ اللہ کے خانوادۂ ذی عظمت کے ہر فرد کو انتہائی احترام کا مستحق گردانتا ہے۔ اس موقع پر میں صرف یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ حضرت مولانا رحمہ اللہ الفاظ کے استعمال میں بے حد محتاط تھے۔ ان کے عقیدت مند بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے گھرانے کے لائق احترام اہل علم اس باب میں ان کا تتبع کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ الفاظ کا کبھی قحط نہیں پڑا۔ علمائے لغت نے ہر زبان کے الفاظ بہ درجہ غایت محنت اور احتیاط کے ساتھ کتب لغات میں محفوظ کر کے لکھنے اور بولنے کے حوالے کر دیے ہیں، ان الفاظ سے فائدہ اٹھانا اور مناسب اسلوب میں استعمال کرنا لکھنے اور بولنے والوں کا کام ہے۔

اس درجہ عظیم القدر خاندان کے کسی فاضل رکن کی تفہیم ہرگز میرا منصب نہیں، لیکن ان کی خدمت میں اتنی سی گزارش پیش کرنے کا حق تو بہرحال پہنچنا چاہیے کہ ''جہالت'' کی جگہ کوئی اور لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس قسم کے مقامات پر ''سہو'' کا لفظ بھی بولا جا سکتا ہے، ''غلط فہمی'' کہنے سے بھی مطلب حل ہو جاتا ہے، ''ناواقفیت'' کے لفظ سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے، ''لغزش فہم'' کی ترکیب سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ ان سطور کے راقم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی اہل علم کی طرف ''جہالت'' وغیرہ کے الفاظ منسوب کرنے سے اہل علم کے لیے دامن کشاں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ تحقیق وکاوش سے تعلق رکھنے اور تصنیف وتالیف میں منہمک رہنے والے شخص کی صاف لفظوں میں تجہیل کرنا میرے خیال میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کے زاویہ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پھر نبی ﷺ کے خوش بخت سیرت نگاروں پر تو خاص طور سے لازم آتا ہے کہ کسی چھوٹے بڑے کے بارے میں اظہار رائے کرتے وقت الفاظ کے انتخاب میں بہ درجہ غایت احتیاط کا ثبوت بہم پہنچانے کی کوشش فرمائیں کہ نبی ﷺ کا طرز عمل اور اسوۂ حسنہ یہی تھا۔'' (دبستان حدیث: ۲۰۷)

القصہ مولانا بھٹی رحمہ اللہ اس حوالے سے بہت محتاط تھے، علماء کی شان میں گستاخی کو بہت بڑا جرم گردانتے تھے، اس بابت بلاشبہ وہ نمونہ اسلاف تھے، انھوں نے بار بار اپنی کتابوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے، کہ میری کوشش ہوتی ہے کہ میرے قلم سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، کسی کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے اس کوشش میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے، مگر جماعت کے ایک جلیل القدر عالم دین اور اپنے استاذ ''حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ رحمہ اللہ'' کے تذکرہ میں ذرا تلخی آگئی ہے، اس کا احساس ہر اس شخص کو ہوگا جو حضرت مولانا کی قد آور علمی شخصیت سے واقف ہے، اس بات کی طرف حضرت الاستاذ شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی حفظہ اللہ اور ان کے دیگر احباب نے ایک مجلس میں مولانا بھٹی کی توجہ مبذول کرائی تھی تو مولانا بھٹی نے ان کا تذکرہ دوبارہ لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا، سنا ہے کام بھی شروع کر دیا تھا، معلوم نہیں تکمیل ہو پائی یا نہیں۔ تلخی تو ضرور ہے مگر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی علمی عظمت اور بلند پایہ مرتبت کے سامنے مولانا بھٹی کا قلم جھک جھک جاتا ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ حضرت مولانا گوجرانوالہ مولانا بھٹی کے استاذ بھی تھے۔ بہرحال معاملہ جو بھی ہو مولانا بھٹی نہایت محتاط تھے، تمام اہل علم خواہ وہ کسی بھی مکتب فکر کے ہوں مولانا کے قلم نے کہیں بھی کسی کی تحقیر وتذلیل نہ کی، یہ معاملہ صرف ان کے قلم تک محدود نہ تھا بلکہ یہ ان کی زندگی کا عملی حصہ تھا، ان کی ذاتی زندگی اس پہلو کا حسین مرقع تھی، یہی وجہ ہے کہ مولانا

بھٹی رحمہ اللہ کو ہر دل عزیزی اور محبوبیت حاصل تھی، تمام مسالک کے لوگ ان سے محبت رکھتے تھے، ہندوستان کے کبار اہل علم کی صحبت کا شرف اس خاکسار کو بھی حاصل ہے، تمام اہل علم سے ہمیشہ ان کی تعریف ہی سنی، ان کی کاوشوں کو سراہتے دیکھا۔ مولانا بھٹی کا دل اس قدر کشادہ تھا کہ معاصرین اہل علم میں چھوٹے لوگوں پر بھی لکھا، بہت سے اہل علم سے رابطہ کرتے، اظہار محبت فرماتے، دعاؤں اور حوصلہ افزائیوں پر بات ختم کرتے، حضرت الاستاذ شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی، حضرت الاستاذ شیخ عبدالمعید مدنی اور مولانا عبدالوہاب خلجی حفظہم اللہ وتولاھم کے پاس متعدد بار فون کرتے خیر خیریت لیتے تحریروں پر سراہتے اور دعائیں دیتے۔ یہ تھا مولانا بھٹی کا خوبصورت چہرہ جسے دیکھ کر، پڑھ کر، سن کر ہر شخص گرویدہ ہو جاتا، ان کے گیسویے باکردار کا اسیر ہو جاتا، اس دور میں اہل علم کے لیے ان کی زندگی کھلی کتاب ہے، وہ تھے تو ہمارے ہی عہد کے مگر ان کی ہر چیز ہر طرز عمل اسلاف کی یاد تازہ کرتا تھا۔ ہماری صفوں میں ایسے اہل علم ضرور موجود ہیں مگر بہت تھوڑے جو اپنے اعلی کردار سے ہر شخص کے دل میں جگہ بنالیں، اپنے علم وعمل سے سلف صالحین کے نمونے پیش کریں، ظاہر یہ چیزیں یوں ہی نہ حاصل ہوں گی، بلکہ ان کے لیے بڑی تگ و دو کی ضرورت پڑے گی، مادیت پسندانہ اور مفاد پرستانہ مزاج سے بالکلیہ دست کش ہونا پڑے گا۔ اور یہ بہت جگر کاوی سے ممکن ہے۔

مولانا بھٹی رحمہ اللہ کی دوسری خوبی اپنے مسلک حقہ سے گہری وابستگی تھی، وہ ہر مقام پر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور اس پر سختی سے کاربند تھے، مگر بے جا تصلب ہرگز نہ تھا۔

ایک جگہ تحریکات کے تذکرہ سے پہلے لکھتے ہیں:

''میرا مسلکی تعلق چوں کہ اہل حدیث سے ہے اس لیے میں سب سے پہلے اسی جماعت کا تذکرہ کروں گا۔ (گزر گئی گزران: ۲۷۶)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کئی سال کی بات ہے کہ میں نے لاہور کے ایک ماہنامہ میں بعض شخصیتوں کے بارے میں اپنی یادداشتیں (بصورت خاکہ) لکھنا شروع کیں۔ ان میں بعض غیر مسلم شخصیتیں بھی تھیں اور بعض غیر اہل حدیث بھی۔ ان میں کسی انداز میں اہل حدیث کا تذکرہ بھی آجاتا تھا۔ ایک دن پنجاب کے محکمۂ اطلاعات کے ڈائرکٹر ملاقات کے لیے میرے دفتر آئے، وہ میرے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں، علیک سلک کے بعد بولے: میں بہت سے اخبارات و رسائل پڑھتا ہوں، لیکن تمہارے جیسا جماعت اہل حدیث کا مبلغ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تم غیر مسلموں پر مضمون لکھو تو اس میں بھی جماعت اہل حدیث کا ذکر ضرور لے آتے ہو۔

یہ تو خیر ہنسی مذاق کی بات تھی جو انھوں نے کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تین چیزوں کو نہیں بھول سکتا۔

اول: اہل حدیث کو کہ یہ میرا مسلک ہے اور اسی مسلک کے عالمین وحاملین کے حضور میں نے زانوے شاگردی تہہ کیا اور انہیں حضرات میں زندگی بسر کی۔ اس کی کسی تنظیم سے وابستگی اختیار کروں یا نہ کروں، لیکن اس گروہ سے الگ نہیں ہوسکتا۔ البتہ میرا بات کرنے کا ڈھنگ ہمیشہ الگ رہا ہے۔

میرے نزدیک اہل حدیثیت اس ذوق، اس تہذیب، اس ثقافت، اس اعتدال، اس توازن، اس وسط، اس میانہ روی، اس حسن اسلوب، اس رواداری، اس شائستگی، اس طریق عمل اور اسلوب زیست کا نام ہے، جس کی تعلیم ہمیں صاحب حدیث ﷺ نے دی ہے اور جس پر کاربند رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ہر مسئلے پر لڑنے جھگڑنے اور گھسن کمی ہونے کا نام ہرگز اہل حدیثیت نہیں ہے۔''

(نقوش عظمت رفتہ ص: ۲۲۸)

یہ دونوں خوبیاں مولانا بھٹی کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں، ہمارے یہاں بہت سے اہل علم ایسے ہیں جنہیں بلاشبہ مسلک اہل حدیث سے وارفتگی ہے، اس کے لیے سب سے برسر پیکار بھی رہتے ہیں، مگر محسوس ہوتا ہے کہ کم لوگ ایسے ہیں جو جماعت کی اس قدر بڑے پیمانہ پر خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، مولانا بھٹی پوری زندگی خاموش جماعت کی خدمت کرتے رہے، مگر نہ کبھی اس کا ڈھنڈورا پیٹا، نہ دوسرے مسالک کے لوگوں سے محض مسلکی بنیادوں پر دوریاں روا رکھیں، وہ زمینی آدمی تھے اور اسی انداز پہ کام کرنا بھی پسند فرماتے تھے، اعلی ظرفی، کشادہ دلی، بلند کردار اور اپنے مسلک کی حفاظت وخدمت ایسے کمالات ہیں جو انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتے تھے۔ مولانا بھٹی آج ہمارے درمیان نہیں رہے مگر ان کے کارنامے خدمات اور جہود روشن چراغ کے مانند روشنی بکھیر رہے ہیں۔ مولانا بھٹی کو اللہ تعالی نے ایک اور خصوصیت سے نوازا تھا، وہ یہ کہ انہیں جلیل القدر اہل علم کی صحبتیں میسر ہوئیں، مولانا داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ اور مولانا حنیف ندوی وغیرہم کے ساتھ رہے۔ انہیں قریب سے دیکھا اور فیض حاصل کیا، جس سے ان کی زندگی میں قناعت وصاف گوئی اور عجز وانکسار کے ساتھ ساتھ علمی وجاہت وعظمت پیدا ہوئی، اللہ ان تمام اہل علم کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان سب کو جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

# مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ یادوں کے چند نقوش

مولانا ابوبکر قدوسی (لاہور۔ پاکستان)

''نقوش عظمت رفتہ'' تمام مکاتب ہائے فکر میں مقبول ہوئی اس میں اہل حدیث اور غیر اہل حدیث ۲۱ شخصیات کا تذکرہ تھا۔ جبکہ ایک غیر مسلم شخصیت گیانی ذیل سنگھ بھی اس میں شامل تھے۔ گیانی ذیل سنگھ اسحاق بھٹی صاحب کے بچپن کے دوست تھے اور تحریک آزادی میں علاقائی سطح پر دونوں مل کر جدوجہد کرنے میں شریک تھے۔ بعد میں ذیل سنگھ بھارت کے صدر کے عہدے تک پہنچے۔ انہوں نے بھٹی صاحب کو ہمیشہ یاد رکھا اور بطور صدر ان کو ہندوستان آنے کی دعوت بھی دی مگر بھٹی صاحب نہ جا سکے۔

''نقوش عظمت رفتہ'' کے بعد اس سلسلہ کی دوسری کتاب ''بزم ارجمنداں'' شائع ہوئی حسب سابق اس کتاب کو بھی بہت پذیرائی ملی۔ اس میں انیس شخصیات پر تذکرے شامل تھے۔ بھٹی صاحب کا منفرد اسلوب تحریر ان دونوں کتب میں اپنے عروج پر تھا۔ آسان اور شستہ انداز تحریر قاری کا دل موہ لیتا، اس کتاب میں انہوں نے مرحومین کے ساتھ چند زندہ شخصیات کے تذکرے کو بھی شامل کیا۔

ان دو کتب کے شائع ہونے کے ساتھ ہی ''مارکیٹ'' میں آپ کے مضامین کی طلب اور انتظار سوا ہو گیا۔ ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' کی نوکری کے دور میں آپ ایک مخصوص حلقے میں محدود ہو کر رہ گئے تھے اور دائرہ کار بھی محدود تھا، ادارہ ثقافت سے نکل کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کو تھے کہ ان کتب کی صورت میں آپ جیسے عوام میں آ گئے۔ پاکستان بھر سے عوام اور خواص آپ سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ آپ دوسرے تیسرے روز ساندے سے نکلتے اور ''مکتبہ قدوسیہ'' (لاہور) آ جاتے، دو، تین گھنٹے یہاں بیٹھتے، لوگ آتے، آپ کی باتیں سنتے، فیض یاب ہوتے۔ یعنی اک چشمۂ فیض جو پوری آب و تاب سے رواں تھا۔ آپ کی مجلس اتنی دلچسپ ہوتی کہ گمان نہ ہوتا تھا کہ ستر سالہ بزرگ کے ساتھ بیٹھے ہیں یا کسی ہم عمر کے۔ عمر فاروق قدوسی میرے چھوٹے بھائی ہیں، ان کے ساتھ آپ کا خاص پیار تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آتے اور کہتے یار عمر ''کل سے لطیفہ آیا ہوا ہے، تم کو سنانے کے لیے صرف آیا ہوں'' اور پھر گفتنی ناگفتنی میں بھی چاہتا تھا۔ بھٹی صاحب کا ''نیا حلقہ احباب'' تشکیل پا رہا تھا۔

ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ ''یار ابوبکر میری بیوی کہتی ہے کہ ان لڑکوں کا ساتھ نہ چھوڑنا، جب سے ان سے تعلق بنا ہے تمام معاملات میں برکت آ گئی ہے۔'' میرا قہقہہ بلند تر تھا۔ کہ لو بھئی ہم بھی برکت والے بابا جی بن گئے۔ حالانکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کا قلم اتنا جان دار تھا اور لکھا اس قدر شان دار کہ ہر سو دھوم مچا رہا تھا۔

انہی دنوں میں نے ان سے کہا کہ مختلف مکاتب ہائے فکر کے بزرگوں کے بارے میں آپ کے تحریر کردہ خاکے شائع کرنا ہمارا اصل مقصد نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ برصغیر کے اہل حدیث کی جامع اور مبسوط تاریخ مرتب کی جائے، کہ یہ میرے والد رحمہ اللہ کا ذوق اور شوق تھا۔ انہوں نے اس پر ایک قدم اٹھایا تھا کہ اپنے رب کے پاس چلے گئے۔ مشاورت ہوتی رہی اور معاملات اپنی درست سمت طے ہوتے رہے۔ ان ہی دنوں ہمارے ایک دوست اور برادر بزرگ عارف جاوید محمدی اس کہانی میں آ شامل ہوئے۔ عارف جاوید محمدی کویت میں ہوتے ہیں، میرے والد محترم کے ساتھ بھی ان کا خاص پیار اور تعلق تھا، میرے والد پاکستان سے باہر ایک ہی سفر کر سکے تھے اور وہ کویت کا تھا اور جمعیت اہلحدیث کے کسی کام کے لیے گئے تھے اور کام بھی جمعیت احیاء التراث الاسلامی میں عارف جاوید محمدی سے متعلق تھا۔ عارف جاوید صاحب اہل حدیث بزرگوں اور تاریخ کے متعلق بہت ذوق اور شوق کے حامل ہیں۔ آپ بھٹی صاحب کے پاس پہنچتے ہیں اور ان ہی جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ جن کے لیے میں چند برس قبل اسحاق بھٹی صاحب کے دولت کدے پہ حاضر ہوا تھا اور یوں ایک اہم معاملہ طے پا گیا۔ عارف صاحب نے بھٹی صاحب کے بہت سے ''ذاتی معاملات'' اپنے ذمے لے لیے اور بہت حد تک ان کو روزمرہ امور کی فکر سے آزاد کر دیا۔ اس ''آزاد فکری'' نے بھٹی صاحب کے قلم کو کسی رواں سے بھی تیز کر دیا اور تاریخ اہل حدیث کے حوالے سے کتنے ہی شاہ کار منظر عام پر آئے۔

میرے والد محترم نے تاریخ اہل حدیث پر لکھنے کا جو اراوہ باندھا تھا اس کا ایک خاکہ لکھا تھا جس میں چند زمانی کے ساتھ بالترتیب ابواب بندی کی تھی۔ کہ اس ترتیب سے لکھا جائے گا۔ جناب اسحاق بھٹی صاحب کا انداز اور اسلوب اور سوچ الگ تھی ان سے طے ہوا۔ کہ مختلف میدانوں میں اہل حدیث حضرات کی کاوشوں اور ان کے ذاتی حالات کو قلم بند کیا جائے اس میں تاریخ اور تاریخی واقعات کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے گا۔ عارف جاوید صاحب نے بھٹی صاحب سے لکھوانے کی ذمہ داری اٹھائی، میں نے شائع کرنے کی۔ چنانچہ اس سلسلے کی بھی کتاب منظر عام پر آئی۔ جس کا نام تھا ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' جناب اسحاق بھٹی صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی نوکری کے دنوں میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ''برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش'' تھا۔ ''اہل حدیث کی آمد'' دراصل اس کتاب کا ہی نیا روپ تھا۔ جس میں مناسب قطع و برید اور اضافے کیے گئے تھے۔ یہ

کتاب خاصی پسند کی گئی۔ اس کتاب کو آپ اس سلسلے کی تمہید اور مقدمہ کہہ سکتے ہیں جو آگے شروع کرنے کا ہمارا ارادہ تھا۔

اس سلسلے کی دوسری کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن'' تھی جو تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل نسبتاً صحیح کتاب تھی، اس میں ۱۸۵/اصحاب کے تذکرے شامل تھے۔ جب کتاب لکھی جارہی تھی تو ایک روز مذاق میں میں نے بھٹی صاحب کو کہا کہ آپ لاکھ لکھتے رہیں، اگر ہم ناشرین ان کتب کو شائع ہی نہ کریں تو آپ کیا کر سکتے ہیں، تو خدام قرآن حرف لکھنے والے تو نہ ہوئے، ناشرین بھی تو ہیں، بھٹی صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے، بات تو تمہاری درست ہے کہ ان کتب کو شائع کرنا بھی تو خدمت ہی ہے۔ میں نے تو یہ بات از راہ تفنن کی تھی، مگر آپ نے اس کو سنجیدہ طور پر لیا اور اپنی کتاب ''خدام قرآن'' کے آخر میں چھتیس اہل حدیث ناشرین اور ان کے اداروں کا مختصر تعارف بھی دے دیا۔

جن دنوں ''خدام قرآن'' شائع ہوئی، ان ہی دنوں میں میری توجہ ''مکتبہ قدوسیہ'' کے علاوہ کچھ اور کاروباری امور کی طرف ہوگئی اور بھٹی صاحب کی کتب کی اشاعت میں تاخیر ہونے لگی۔ آپ اتنے زیادہ مروت والے تھے کہ بہت عرصہ مجھ سے اس بابت کوئی شکایت نہیں کی۔ دوسری طرف وہ مسلسل لکھ رہے تھے۔ فطری بات ہے کہ بندہ جب لکھتا ہے تو چاہتا بھی ہے کہ یہ شائع ہو اور میں ایسا کر نہیں پا رہا تھا۔ ایک روز مکتبہ قدوسیہ تشریف لائے۔ ان کو بات کرتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی، لمبی تمہید باندھی اور کہنے لگے کہ ''میری کتب شائع نہیں ہو پا رہی اگر آپ بھائی ناراض نہ ہوں تو کچھ دوسرے ناشرین دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں ان کو چند کتب دے دوں'' الحمدللہ! میرا مزاج ان معاملات میں بہت کھلا رہا ہے۔ میں نے ان کی ہچکچاہٹ بھری تمہید اور مدعا کو بھرپور 'انجوائے' کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ:

جا تجھ کو آزاد کیا

ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ ''اس میں ایسی کیا بری بات ہے۔ اگر دوسرے دوست اس نیکی کے کام میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہے۔'' اور سچی بات یہ ہے کہ یہ اعزاز اور خوش نصیبی کہ اللہ نے یہ کام مجھ سے شروع کروایا یہ تو میرے لیے ہی خاص رہنا تھا۔ تو بخیلی کس بات کی۔ یقیناً سرد اور تاریک راتوں میں اٹھ کر فصل کا بیج لگانا، اس کی دیکھ ریکھ کرنا، بہت محنت طلب کام ہوتا ہے، اس کے لیے حوصلہ مند دل درکار ہوتے ہیں اور جب فصل پک جاتی ہے تو اس کو کاٹنے کے لیے وہی راتوں کا شب بیدار کسان سب کو بلاتا ہے کہ آؤ اس کو مل کر کاٹیں۔ ایسے میں اگر کوئی تنگ دل ہو کر کہے کہ میں نے ہی اس تمام فصل کو کاٹنا ہے، تو کبھی فصل خراب بھی ہو جاتی ہے۔ تو میں نے اپنی اس کاشت کو خراب تو نہیں کرنا تھا۔ زندگی صرف منفی پہلو اور باتوں کے گرد نہیں گھومتی اس میں بے شمار مثبت باتیں بھی ہوتی ہیں جو دل کو حوصلہ دیتی ہیں، جب اسحاق بھٹی صاحب فوت ہوئے تو جس طرح پاکستان بھر سے احباب نے مجھ سے آ کر تعزیت کی، تب مجھے یہی لگا کہ جناب کو ہمارا اس کا آغاز کرنا نہ صرف یاد ہے بلکہ وہ اس کے قدردان بھی ہیں فجزا اللہ احسن الجزاء.

اور سچی بات یہ ہے کہ دوسرے احباب کا اس کام میں شرکت کرنا نفع مند بھی ثابت ہوا کہ بھٹی صاحب کا کام وسعت اور سرعت کے ساتھ منظر عام پر آیا۔

خدام قرآن میں ان احباب کا تذکرہ تھا جن کی خدمات کا محور قرآن کریم تھا۔ اس کے بعد خدمات حدیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''کاروان حدیث'' تھی اس میں ۲۶/ارباب علم کا تذکرہ تھا اور یہ کتاب ۶۴۶/صفحات پر محیط تھی۔ حسب سابق یہ کتاب بھی خاصی پسند کی گئی۔ ''کاروان حدیث'' کے بعد اسی سلسلے کی تین مزید کتب ہم نے شائع کیں، دبستان حدیث، گلستان حدیث، چمنستان حدیث، یوں خدمات حدیث کے اس سلسلے کی بالترتیب چار کتب شائع ہو چکی ہیں جبکہ آخری کتاب ''بوستان حدیث'' کے نام سے بھٹی صاحب مکمل کر چکے تھے، کتابت کے مرحلے میں تھی کہ داعی اجل کا بلاوا آ گیا اور بھٹی صاحب اپنے رب کے حضور چلے گئے۔ جبکہ متفرق شخصیات کے بارے میں ۲۰۰۹ء میں آپ کی تیسری کتاب ''ہفت اقلیم'' شائع ہوئی نام کی مناسبت سے اس میں سات شخصیات کا تذکرہ تھا، اور ساتوں اصحاب اپنے اپنے مقام میں صاحب اقلیم بھی تھے۔ جبکہ اس سلسلے کی اگلی کتاب ''محفل دانش فساں'' بھی لکھی جا چکی تھی۔

عمر کے تفاوت کے باوجود بھٹی صاحب سے ہمارا تعلق بے تکلفانہ تھا اور اس کا سبب ان کی بے پناہ شفقت تھی۔ انہوں نے اپنے مزاج پر کبھی بھی ناروا قسم کی بزرگی مسلط نہ کی تھی۔ وہ ہم کو بے تکلفانہ ناشر کی شر سے متصف کرتے اور کہتے کہ ناشر کہا جائے یا پہلی شر دونوں میں شر آتا ہے اور ان کی اس دریافت پر ہمیشہ ایک قہقہہ بلند ہوتا۔ ان کی مجلس میں بے جا تکلف کا دور دور تک نشان نہ ہوتا۔ عمدہ مزاج کا خود بھی لطف اٹھاتے۔ فیصل آباد کے رمضان سلفی نے ان کے حالات پر ایک کتاب لکھی۔ کتاب میرے پاس طباعت کے واسطے آئی تو رمضان سلفی صاحب کا فون آیا کہ بھٹی صاحب کے نام کے اوپر ''مورخ اہل حدیث'' ضرور لکھنا ہے۔ میں نے لکھوا دیا ابھی سرورق کا ڈیزائن بنا تھا تو بھٹی صاحب تشریف لے آئے۔ مورخ اہل حدیث کا لفظ دیکھ کر کہنے لگے ''یار یہ ضرور لکھنا تھا! رہنے دیتے'' میں نے بے ساختہ کہا ''ٹھیک ہے مورخ کاٹ کر ''مورکھ'' کر دیتے ہیں۔'' بھٹی صاحب کا قہقہہ مجھ سے بلند تھا۔ انہوں

نے میرے اس جملے کا بہت مزہ لیا اور دیر تک ہنستے رہے اور جملے کی تعریف کرتے رہے اور ہاں اسی صاحب وسیع القلب نے مجھ پر گستاخی بزرگاں کا کوئی فتویٰ بھی نہ لگایا۔

ایک روز میں نے مذاق میں کہا کہ آپ نے بے شمار افراد کے بارے میں لکھا۔ لیکن آپ کے بارے میں کوئی نہ لکھے گا۔ پھر میں نے خود کہا کہ بے فکر رہیں میں آپ کے بارے میں لکھوں گا۔ اس پر بہت ہنسے۔ پھر عارف جاوید محمدی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ اپنی خودنوشت تحریر کریں اور یوں ''گذر گئی گذران'' منظر عام پر آ گئی۔ شاید ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ہم لوگوں کی ''استعداد کار'' رہی ہو گی کہ ہم لوگ واقعی ان کے بارے میں یا سوانح حیات نہیں لکھیں گے، سو انہوں نے ہمارا یہ قرض بھی خود ہی ادا کر دیا اور اپنی سوانح حیات ''گذر گئی گذران'' لکھ گئے۔

ان کے مزاج میں اس قدر وسعت تھی کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ جن دنوں ہفت اقلیم لکھی جا رہی تھی انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ان کے مضامین کمپوزنگ کے لیے آ رہے تھے۔ احسان الٰہی ظہیر شہید کے بارے میں ان کا مضمون آیا۔ علامہ شہید سے گہرے تعلق کے سبب اس مضمون کا انتظار تھا۔ شاید ہم ''زیادہ'' کی امید پر تھے مگر:

ہم تو سمجھتے تھے برسات بھی ہو گی شراب کی بارش
جب آئی برسات ، تو برسات نے دل توڑ دیا

مضمون ہمارے امید کے خلاف تھا۔ بعض باتوں کا دکھ ہوا میں نے بھٹی صاحب کو کئی صفحات پر مشتمل خط لکھا۔ اس میں ان کے مضمون کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا اور ان کی بعض عبارات کو نقل کر کے اس کے جواب میں اپنا موقف پیش کیا۔ غالباً بارہ صفحات پر مشتمل خط تھا۔ چند روز میں تشریف بھی لے آئے۔ میرا خط اور اپنے مضمون کا مسودہ ہاتھ میں تھامے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ کہنے لگے ''اتنی محنت کی تم نے اور اتنا لمبا خط لکھا جو باتیں غلط تھیں بتا دیتے، میں کاٹ دیتا۔'' نہ ایک لفظی بحث نہ اپنے موقف پر اصرار۔ نصف صدی کا فرق تھا ان کا مجھ سے۔ درجنوں کتابیں لکھ چکے تھے۔ کمال کا انکسار تھا ان میں۔ پھر مجھ سے کہا کہ علامہ کے بارے میں کچھ لکھ دو، میں اپنے الفاظ میں مضمون کا حصہ بنا دوں گا۔ میں نے لکھ دیا اور انہوں نے مناسب قطع و برید کے بعد شامل کر دیا۔

مکتبہ قدوسیہ نے مولانا محمد اسحاق بھٹی کی گیارہ کتب شائع کیں۔ جبکہ دو کتب اشاعت و طباعت کے مراحل میں ہیں۔ اب آپ ان کے نام ملاحظہ کریں۔

(۱) نقوش عظمت رفتہ (۲) بزم ارجمنداں (۳) ہفت اقلیم (۴) برصغیر میں اہل حدیث کی آمد (۵) قافلہ حدیث (۶) دبستان حدیث (۷) گلستان حدیث (۸) چمنستان حدیث (۹) برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن (۱۰) مولانا احمد دین کھکھڑوی (۱۱) اسلام کی بیٹیاں (۱۲) محفل دانش منداں (۱۳) بوستان حدیث۔

عمر کے اس تفاوت کے باوجود ہماری ان سے دوستی تھی۔ ایسے ہی جیسے کسی پوتے کی اپنے دادا سے بے تماشا دوستی اور بے تکلفی۔ کچھ ایسا ہی تو رشتہ تھا ان کا اور ہمارا:

میں کیا لکھوں جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں

اور اس سے بھی زیادہ سچی بات یہ ہے کہ میرے سے کہیں زیادہ ان کی محبت عمر فاروق قدوسی سے تھی۔ میں اپنی بے ہنگم مصروفیات کے سبب وقت کم بھی دے پاتا اس پہ وہ شکوہ کناں بھی رہتے۔ عارف جاوید صاحب سے جلدی گاہے گاہے شکایت بھی کرتے مگر میں ویسا کا ویسا ہی رہتا۔ مگر آج ان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہی شفقت، ویسی ہی محبت مگر شاید یہ کہتے ہوئے کہ میں تم کو کہتا تھا کہ تم آتے نہیں، خیال نہیں کرتے میرا، لو اب ''ڈھونڈو'' مجھے چراغ رخ زیبا لے کر۔

ہائے آج میں سوچ رہا ہوں کہ عمر فاروق قدوسی خوش قسمت نکلے کہ ان کے پاس مسلسل جاتے ان سے سیکھتے۔ عارف جاوید صاحب بتا رہے تھے کہ بھٹی صاحب کے گھر والے ان کو کہنے لگے کہ اب ان کا جی نہیں لگتا، دل کی بات کسی سے کم ہی کرتے ہیں۔ صرف جب عمر فاروق قدوسی آتے ہیں۔ تب یہ بدلے بدلے لگتے ہیں جیسے کسی کو من پسند دوست مدت بعد ملے، عارف صاحب عمر فاروق سے کہہ رہے تھے کہ وہاں جانے میں سستی نہ کیا کرو۔

کئی برس پرانی بات ہے کہ ایک روز مکتبے پر آئے اور کہنے لگے کہ ''یار میں اس ڈاکٹر فضل الٰہی سے بہت خوش ہوا ہوں''۔ چند روز پہلے ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب نے مرکز اہل حدیث لارنس روڈ پر جمعہ پڑھایا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد حاضرین ڈاکٹر صاحب کے گرد جمع تھے اور ڈاکٹر صاحب آہستہ آہستہ مسجد سے نکل رہے تھے۔ بھٹی صاحب جمعہ پڑھنے گئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے گرد اس ہجوم عاشقان کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے ملے، ڈاکٹر صاحب نہایت عقیدت و احترام سے پیش آئے اتنے میں دروازہ آ گیا، بھٹی صاحب اپنا جوتا اٹھانے جھکے، ڈاکٹر صاحب تیزی سے آگے بڑھے اور بھٹی صاحب کا جوتا اٹھا لیا۔ لوگ حیران کہ یہ بابا جی کون ہیں کہ اتنی عزت افزائی کر رہے ہیں ان کی ڈاکٹر فضل الٰہی۔ بھٹی صاحب اس بات کو فراموش نہ کر سکے اور ڈاکٹر صاحب کے لیے بہت محبت بھرے الفاظ کہتے رہے۔

جماعتوں میں اکھاڑ پچھاڑ اور گروپ بندی کا سلسلہ پرانا ہے اور ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے۔ ایک روز دو جماعتوں کے اختلاف کے بارے میں مجھ سے پوچھنے لگے کہ ''یار ابوبکر یہ کیوں الگ ہو گئے ہیں؟'' میں نے مذاقاً کہا ان کو چھوڑیے

اپنی بات کرتے ہیں اور ایک الگ جماعت بناتے ہیں، آپ امیر بن جایئے گا میں ناظم اعلیٰ، جتنے دن چلیں گے بسم اللہ اور پھر نہ نبھے گی تو الگ ہو جائیں گے۔ پھر ہماری بھی دو الگ الگ جماعتیں بن جائیں گی اور بھٹی صاحب کا ایک قہقہہ بلند ہوا ''یار تمہاری تجویز بہت پسند آئی لیکن فرصت میں یہ کام کرلیں گے۔''

پچھلے برس مجھے ان کے ساتھ سفر کرنے کا بھی موقع ملا، سیالکوٹ میں ہمارے مکتبے کی کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ جس کا اہتمام مولانا محمد علی جانباز کے ادارے ''جامعہ رحمانیہ'' نے کیا تھا۔ قاری عبدالرحمان جو مولانا جانباز کے داماد بھی ہیں اور ان کے مدرسے کے ناظم بھی اور ان کے ساتھ مولانا کے بیٹے عبدالحنان۔ دونوں بھٹی صاحب سے نہایت عقیدت کا رشتہ رکھتے ہیں، انہوں نے بھٹی صاحب کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ یہاں میں یہ ذکر کر دوں کہ بھٹی صاحب کی شخصیت پر جو کتاب رمضان یوسف سلفی نے لکھی ہے وہ جامعہ رحمانیہ نے ہی شائع کی ہے، قاری عبدالرحمان نے مجھے کہا کہ آپ نے بھٹی صاحب کو اپنی گاڑی پر لے کر آنا ہے، بہت خوش گوار سفر رہا۔ ہم نے تمام راستہ بھٹی صاحب کو سنا، لطائف، واقعات سب چل رہے تھے۔ تحریک آزادیٔ ہند سے متعلق کافی گفتگو رہی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ میرے والد محترم مسلم لیگی سوچ کے حامل تھے، جبکہ میں اس کے برعکس پاکستان سے تمام تر محبت کے باوجود تقسیم وطن کو تقسیم امت بھی جانتا ہوں۔ ہندوؤں کی تنگ نظری اور پست سوچ تقسیم کے حامیوں کے دلائل میں وزن پیدا کرتی ہے، جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایکا نہیں اور برصغیر کے مسلمانوں کی تین جگہوں پر تقسیم وحدت ہند کے حامیان کے لیے دلائل مہیا کرتی ہے۔ اس بحث کا یہاں مقام نہیں۔ لیکن چلتے چلتے ایک دلچسپ واقعہ لکھتا چلوں یہ ۱۹۸۶ء کا ذکر ہوگا میں تب کالج میں پڑھتا تھا اور اہل حدیث یوتھ فورس کے لیے خاصا سرگرم عمل۔ تب ہم اتنے ''بڑے'' نہ تھے کہ مسلم لیگی یا کانگریسی ہوتے۔ ہم دوستوں نے مل کر ایک مقابلہ مضمون نویسی منعقد کیا۔ اس کا عنوان تھا ''تحریک پاکستان میں اہل حدیث کا کردار'' مقالے جمع ہو گئے۔ میرے والد محترم مولانا عبدالخالق قدوسی اور حافظ صلاح الدین یوسف کو منصف ٹھہرایا گیا۔ میں مضامین کا پلندہ اٹھائے ''الاعتصام'' کے دفتر گیا۔ راستے میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے لیے کوئی پیغام تھا۔ ان کے پاس رکا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے یہ کیا کاغذات اٹھائے پھر رہے ہو، میں نے عرض کیا کہ یہ مقابلہ کے مضامین ہیں۔ مولانا حنیف مسکرانے لگے اور کہنے لگے ''بڑے مسلم لیگی بنے پھرتے ہو'' تب تک مجھے مولانا کے سیاسی رجحانات کا پتہ نہ تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مدت بعد میں ذہنی طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے کا قائل ہو گیا۔ ایک اور بات یاد آئی جب ہم نے کتاب ''ہفت اقلیم'' شائع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کی خبر نکلی کہ اس میں پہلا مضمون مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں ہے۔ تو جماعت اسلامی کے بعض قریبی احباب نے مجھ سے رابطہ کیا کہ بھٹی صاحب کو کہیں کہ اس میں مناسب قطع برید کر دیں۔ ویسے ہی نہ شائع کر دیا جائے۔ قصہ اس کا یوں تھا کہ مولانا مودودی کے بارے میں بھٹی صاحب کا مضمون گزرے وقتوں میں مجیب الرحمان شامی کے ''قومی ڈائجسٹ'' میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مضمون میں بھٹی صاحب کے قلم کی کاٹ احباب جماعت کے نازک مزاجوں پر گراں گزری تھی اور بھٹی صاحب ان دنوں جماعت کے ناپسندیدہ افراد میں شامل ہو گئے تھے۔ میں نے بھٹی صاحب سے کہا کہ ان کی بات مان لینے میں کیا حرج ہے؟ ویسے بھی کسی ڈائجسٹ میں چھپنے والے مضمون اور کتاب میں فرق ہوتا ہے۔ کتاب کی حقیقت زیادہ بلند اور مضبوط ہوتی ہے۔ بھٹی صاحب نے اس بات کو تسلیم کیا اور بعض ایک باتیں قلم زد کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم ہمارے احباب اس پر راضی ہوئے یا نہیں۔

لیکن اس کے باوجود مضمون کا مجموعی تاثر ناقدانہ ہی تھا اور بھٹی صاحب جنہوں نے دوسرے بزرگوں پر بہت تاریخی اور شاندار مضمون لکھے اپنی روایت نہ نبھا سکے۔ چنانچہ ان کو اور کسی حد تک مجھے اس کے ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں علامہ شہید سے محبت اور قرابت داری کے سبب لوگوں کا یہ رویہ تھا۔ لیکن اس میں میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر بعض مقامات پر بھٹی صاحب نے بے تکلفی سے کچھ باتیں لکھ دی ہیں تو اس پر اتنی گرفت کی کیا ضرورت ہے کہ وہ علامہ شہید سے عمر میں شاید ربع صدی بڑے تھے اور دوسرے کبھی ان کی جماعت کا حصہ نہیں رہے۔ اس کے علاوہ علامہ شہید خود بھی تنقید کو اتنا ''مائنڈ'' نہیں کرتے تھے۔ اس مضمون کے باوجود مولانا اسحاق بھٹی صاحب کو علامہ شہید سے پیار تھا اور اسی طرح ان کے صاحب زادے حافظ ابتسام الٰہی ظہیر سے بھی بہت پیار کرتے تھے۔ بہت مرتبہ مکتبہ قدوسیہ پر بیٹھے حافظ ابتسام الٰہی ظہیر کا تذکرہ آجاتا، تو نہایت محبت سے ان کا ذکر کرتے اور کہتے کہ مجھے اس سے محبت محسوس ہوتی ہے، کیونکہ وہ بہت لائق اور متقی لڑکا ہے، یہ بھی کہا کرتے کہ میری بہت عزت کرتا ہے۔ جب ابتسام الٰہی ظہیر نے مینار پاکستان پر ایک بڑا جلسہ کیا تو اسحاق بھٹی صاحب نے اس پر ایک نہایت دلچسپ پیرایہ میں ایک مضمون لکھا، جو بعض حوالوں سے عمدہ اور لطیف اشارے لیے ہوئے تھا۔ پڑھنے کے لائق ہے۔

الغرض بڑی خوبیوں کے مالک تھے مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔ اللہ رب العالمین غریق رحمت کرے۔ آمین

☆☆☆

# مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی گزر گئے

مولانا محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

بالآخر ایک طویل عرصے تک علمی دنیا کو اپنے قلم سے اسیر رکھنے والا اور اگلوں کو پچھلوں کی داستاں سنانے والا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ جس نے کبھی عظمتِ رفتہ کے نقوش قرطاس ابیض پر ثبت کیے۔ جس نے سلف کے کارداں اور خدام قرآن وحدیث کے قافلوں کی نشاندہی کی۔ جس نے محدثین کے دبستاں کو گلستاں بنانے کی سعی کی اور اپنی پوری زندگی ارجمندوں وخردمندوں کی بزم سجانے میں گزار دی۔ آخر کار اپنی گذران بھی گزر گیا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی وغیرہم جیسے بزرگوں کی زیارتیں کیں۔ مولانا سیّد داود غزنوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا حافظ محمد لکھوی وغیرہم سے علمی استفادہ کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد حنیف ندوی وغیرہم کی شرف مجالست سے مفتخر ہوئے۔ ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء کو اپنی مختصر علالت کے بعد اس دنیائے دوں کی اسیری ترک کر کے خلد بریں کے راہی ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا محمد اسحاق بھٹی کو اللہ نے طویل عمر عطا کی۔ زندگی کی کامل ۹۰ر بہاریں دیکھنا انہیں نصیب ہوا۔ ان کی نگاہیں بے شمار تاریخی حوادث وواقعات کی امین بنیں۔ اپنے ذوق کے مطابق متعدد اصحاب علم وفضل کی ہم نشینی کا شرف انہیں حاصل ہوا۔ بڑوں کی علمی معرکوں کے رازدار بنے۔ ان کے قلم نے بہت لکھا۔ وہ اعلیٰ معیار کے ادیب ونثر نگار تھے۔ ان کی تحریروں کو پاک وہند کے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ بہت کم مصنفین ہیں جن کی کتابیں ہر حلقے اور رجحانِ فکر سے تعلق رکھنے والے اہل علم شوق سے پڑھتے ہوں، مولانا اسحاق بھٹی کا شمار ایسے ہی اہل علم میں ہوتا ہے۔

وہ گو کہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے، اور زیادہ تر ان کے قلم نے اپنے مسلک سے تعلق رکھنے والے اکابرِ علم کے ہی حالات قلم بند کیے۔ بالخصوص آخری دور میں ان کی زیادہ تر سوانحی مضامین اہل حدیث اشخاص کے ہی گرد گھومتے تھے۔ مگر ان کی تحریروں کو ہر حلقہ علم وفن میں یکساں مقبولیت حاصل تھی۔ وہ ایک اعلیٰ پایے کے خاکہ نگار تھے، ان کی خاکہ نگاری ان کی تاریخیت پر غالب تھی۔

انہوں نے ترجمے وتدوین کا کام بھی انجام دیا۔ ابن ندیم کی الفہرست کا ترجمہ و حواشی علمی دنیا کے لیے ان کے قلم سے ایک گراں قدر علمی ارمغان ہے۔

مولانا اسحاق بھٹی ۱۵ر مارچ ۱۹۲۵ء کو مشرقی پنجاب کی ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں کوٹ کپورہ میں پیدا ہوئے۔

مولانا بھٹی کو بچپن ہی سے کسبِ دینی کا ذوق تھا اور اس ذوق کو پروان چڑھانے میں ان کے دادا میاں حکیم محمد مرحوم کا نمایاں کردار تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی اپنے دادا ہی سے حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف درس گاہوں میں مختلف علماء سے کسبِ علم کیا۔ ان کے مشہور اساتذہ میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا اسماعیل سلفی، مولانا حافظ محمد گوندلوی وغیرہم شامل ہیں۔

وہ شروع سے ہی مصروف عمل وحرکت رہنے والوں میں سے تھے۔ ان کی جودتِ طبع نے آغازِ شباب ہی سے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔ ان کا ابتدائی عہد سیاسی اعتبار سے انتہائی پُر آشوب عہد تھا۔ ادھر ہمارے مولانا جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ رہے تھے اور دوسری طرف برصغیر میں انگریزی استعماریت اپنے آخری دن گزار رہی تھی۔ ایسے مواقع پر عموماً غاصب حکومتیں اپنی سختی ومظالم میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ مگر مولانا موصوف اپنے دورِ جوانی میں تازہ تازہ قدم زن ہوئے تھے۔ انہیں بھی آزادی وانقلاب کا سودا سمایا۔ اپنی ریاست کی پرجا منڈل میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے انہیں پرجا منڈل کا جنرل سکرٹری بنایا گیا۔ اس کے صدر گیانی ذیل سنگھ تھے، جو بعد میں ہندوستان کے بھی صدر جمہوریہ بنے۔ پرجا منڈل میں شرکت کرنے کی وجہ سے انہیں بعض شدید مصائب کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۳۹ء میں کچھ عرصہ فیروز پور جیل میں بھی قید رہے۔ آزادی وطن کے لیے دو مرتبہ انہیں جیل جانا پڑا۔

تقسیم ہند کے بعد ۲۴ر جولائی ۱۹۴۸ء کو مولانا بھٹی نے ہندوستان سے ترکِ سکونت کر کے ہمیشہ کے لیے پاکستان کو اپنا وطن بنالیا۔

یہاں آ کر انہوں نے خود کو مرکزی جمعیت اہلِ حدیث کے نظم ونسق سے وابستہ کیا۔ اس جماعت کے لیے مختلف خدمات انجام دیں۔ جماعتی نظم ونسق کے دوران انہیں مولانا داود غزنوی، مولانا اسماعیل سلفی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وغیرہم سے بڑی کثرت سے استفادے کا موقع ملا۔ ان کی فکری ونظری تربیت میں ان بزرگوں کا بڑا دخل رہا۔

۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ الاعتصام کا اجراء ہوا تو اس کے معاون مدیر بنے۔ مولانا محمد حنیف ندوی اس کے اوّلین مدیر تھے۔ ۱۹۵۱ء میں مولانا حنیف ندوی کے مستعفی ہونے کے بعد مولانا بھٹی الاعتصام کے مدیر بن گئے۔

اکتوبر ۱۹۶۵ء کو پاکستان کے مشہور اسلامی تحقیقی ادارے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے بطور ریسرچ اسکالر منسلک ہوئے۔ اس زمانے میں اس کے ڈائرکٹر شیخ محمد

اکرام تھے۔ یہاں مختلف ذوق ومزاج کے اہل علم مجتمع تھے۔ مولانا بھٹی کو یہاں مولانا حنیف ندوی، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، رئیس احمد جعفری جیسے اصحابِ علم کے ساتھ کام کرنے کے مواقع ملے۔ یہاں مولانا نے بھرپور وقت گزارا۔ ۱۹۹۷ء میں ۳۲ رسال تک مسلسل اس ادارے سے وابستہ رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ یہیں مولانا کے قلم سے فقہائے ہند (فقہائے پاک وہند) جیسی کتاب نکلی۔ جس سے بلاشبہ زبانِ اردو کا وقار بلند ہوا۔ اردو زبان میں اس قدر طویل تذکرہ ابھی تک نہیں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش اور برصغیر میں علم فقہ بھی ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے ہی تحریر کیں۔

ان کے قلم سے جن کتابوں کے تراجم ہوئے ان میں ابن ندیم کی الفہرست، امام نووی کی ریاض الصالحین، محمد حسین ہیکل کی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ڈاکٹر فضل الٰہی کی لشکر اسامہ کی روانگی شامل ہیں۔ یہ ترجمے مولانا کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کے مظہر ہیں۔ اس قدر رواں ہیں کہ کہیں سے بھی ترجمے کا گمان نہیں گزرتا۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے انسلاک کے دوران ہی بعض مصنفین کی کتابوں کو نظر ثانی وترتیب دینے کا فریضہ بھی انجام دیا۔

اسی دوران مولانا نے صحافتی خدمات بھی انجام دیں۔ اخبارات میں کالم لکھے۔ بعض سوانحی سلسلے شروع کیے جو بڑے مقبول ہوئے۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک ہفت روزہ ''الاعتصام'' سے منسلک رہے۔ اسی دوران جنوری ۱۹۵۸ء میں سہ روزہ اخبار ''منہاج'' جاری کیا جو صرف تیرہ مہینے اپریل ۱۹۵۹ء تک جاری رہ سکا۔ پروفیسر ابوبکر غزنوی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ ''توحید'' نکالا مگر جلد ہی اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ روزنامہ ''امروز'' اپنے دور کا بہت مشہور اخبار تھا اس میں ایک طویل عرصے تک کالم نویسی کی۔ روزنامہ پاکستان (لاہور) میں بھی ایک عرصہ تک کالم نگاری چلتی رہی۔ مشہور صحافی مجیب الرحمن شامی کے ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں مختلف شخصیات پر سلسلہ تحریر جاری رہا، جسے بڑی پذیرائی ملی۔

انہیں قرآنیات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کے پاس قرآن پاک کے تراجم کا قیمتی ذخیرہ تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے شائع شدہ اردو ''دائرہ معارف اسلامیہ'' میں قرآنیات سے متعلق مولانا بھٹی کے کئی اہم مقالات شامل اشاعت ہوئے۔

وہ ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ ان کے اسلوب نگارش میں مختلف تراکیب کا استعمال، بات سے بات نکالنے کا سلیقہ اور طنز وتنقید کے عمدہ اسالیب اپنے قارئین کو مسحور رکھیں گے۔ تاہم ان کا اسلوب طنز وتعریض کبھی کبھی غیر مناسب انداز اختیار کر جاتا تھا۔ آخری دور میں ان پر صوفیت کا بڑا غلبہ ہوگیا تھا۔ وہ بعض ایسے صوفیانہ افکار وخیالات کی تائید کرتے نظر آتے تھے جن کی مسلک اہل حدیث میں کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔

راقم الحروف کے ساتھ ان کے علمی روابط گزشتہ ۶، ۱۷ برسوں سے قائم تھے۔ میرے نام ان کا پہلا مکتوب گرامی ۱۹۹۸ء کا تحریر کردہ ہے۔ میرے پاس ان کے کئی مکاتیب ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے برقی میڈیا کی مہربانی نے جہاں بہت سے فوائد پہنچائے ہیں وہیں ہمیں بن کاغذ وقلم کی دنیا میں بھی دھکیل دیا ہے۔ اس لیے سلسلہ مکاتبت تو کمزور پڑ گیا چند بار موبائل ہی پر خیر وعافیت دریافت کرلی گئی۔

اس کے علاوہ راقم کو کئی بار ان سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ جب بھی لاہور جانا ہوا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اپریل ۲۰۰۳ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے زیر اہتمام برصغیر میں مطالعہ حدیث کے زیر عنوان منعقدہ سیمینار میں بھی ہم اکٹھے رہے۔

بایں ہمہ مولانا بھٹی نے ایک بھرپور علمی زندگی گزاری۔ ان کی قلمی خدمات مسلم ہیں جنہیں نہ تو فراموش کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز۔ وہ مخالف وموافق سبھوں کے لیے حوالہ بنتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بنتے رہیں گے۔ اللہ رب العزت کے حضور ہماری دعا ہے کہ وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ (**بشکریہ**: الواقعۃ شمارہ: ۴۷ ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ)

☆☆☆

(**ص: ۵۷/ کا بقیہ**) آپ اپنے اسلوب نگارش کی نفاست، سلاست اور ظرافت کے لیے مشہور تھے، آپ کی کتابیں ادب وانشاء پردازی کا بہترین نمونہ، معلومات کا خزینہ اور تاریخ کے قیمتی شہ پارے اور آپ کے وسیع قلب اور وسیع دماغ کا نگارخانہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کویت کی طرف سے ایک بڑے علمی و دینی اجتماع میں علامہ بھٹی کو ''مؤرخ اہل حدیث'' کے خطاب سے نوازتے ہوئے ایک یادگار شیلڈ عنایت کی گئی، اس نیک کام میں ہمارے مخلص فاضل دوست شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی اور شیخ عارف جاوید محمدی کویت حفظہم اللہ کی مخلصانہ کاوش خاص طور پر قابل ستائش ہے۔

آپ کی کتابوں میں خاص بات یہ ہے کہ ہندوستانی بھی ہیں پاکستانی بھی، نیپالی بھی ہیں بنگلہ دیشی بھی، اہل حدیث بھی ہیں دیوبندی بھی، عالم بھی ہیں مسٹر بھی، ادیب بھی ہیں شاعر بھی، صحافی بھی ہیں اخبار نویس بھی، امام بھی ہیں خطیب بھی، مسلم بھی ہیں غیر مسلم بھی، سیاست داں بھی ہیں اور گوشہ نشین بھی، غیر بھی ہیں عزیز بھی، استاذ بھی ہیں شاگرد بھی۔ سب سے خصوصی تعلقات، سب سے برادرانہ خلوص، بزرگانہ شفقت، عزیزانہ محبت، اللہ اللہ! کیسا دل تھا جو سب کے لیے مضطرب، سب کے لیے ہمدرد اور سب کے لیے ان کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔

اللہ موصوف کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے۔

**اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وأکرم نزلہ ..... آمین!**

☆☆☆

# مسلک اہل حدیث کی متاع عزیز.....

مولانا محمد یوسف انور (فیصل آباد، پاکستان)

ہمارے جگری دوست اور مسلک اہل حدیث کی متاع عزیز مولانا محمد اسحاق بھٹی ۲۲ر دسمبر کی صبح تقریباً ۹۱ر برس کی عمر میں ایک دو روزہ علالت کے بعد قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

۱۴ر دسمبر سوموار کی شب ان سے فون پر بات ہوئی، سردی کی شدت کی وجہ سے ان کی طبیعت اور خیریت دریافت کی تو فرمانے لگے کہ ''مولانا عبداللہ گورداسپوری مرحوم آج کل سردیوں میں کہا کرتے تھے کہ بچے اور بوڑھے اس موسم میں رضائی کا مال ہوتے ہیں'' ہم دونوں نے قہقہے لگائے، ان کی ہشاش بشاش گفتگو اور معمول کے مطابق لطائف بھری باتوں سے مجھے حوصلہ ہوا کہ بھٹی صاحب نے ماشاء اللہ اپنے اوپر بڑھاپا غالب نہیں ہونے دیا، مگر وہ ''گزر گئی گزران'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''میری عمر کا یہ آخری دور ہے بچپن گیا، جوانی گئی، کہولت کا دور بیت گیا، اب بڑھاپا اپنا سفر تیزی سے طے کر رہا ہے، یہ بھی ختم ہونے والا ہے، جب پہلے دور نہ رہے جو اس سے کہیں مضبوط تھے، تو یہ کمزور اور لڑکھڑاتا دور کب تک رہے گا''۔

فون پر پندرہ بیس منٹ ان سے گپ شپ رہی، دو تین ہفتوں بعد اکثر فون کر لیتا تھا، کبھی وہ یاد فرما لیتے تھے اور بعض اوقات ہمارے مشترکہ عزیز دوست رمضان یوسف سلفی کی معرفت دعا سلام ہو جایا کرتی تھی، بھٹی صاحب مجھے کہنے لگے کہ اہل حدیث کے ایک پچھلے شمارہ میں آپ کا مضمون ''غزنوی چشمہ فیض'' پڑھ کر ارادہ کر لیا ہے کہ جس طرح روپڑی خاندان پر کتاب لکھی ہے، اسی طرح غزنوی خاندان پر بھی مستقل کتاب لکھوں گا، میرے پاس اس موضوع پر کافی مواد موجود ہے لیکن **وماتشاؤن إلا أن یشاء اللہ**۔

بھٹی صاحب نے مزید بتایا کہ ''چمنستان حدیث'' میں جن موجودین علماء کے متعلق نہیں لکھ سکا، ان کے بارے میں ''بوستان حدیث'' میں لکھ چکا ہوں، جس کا مسودہ تیار ہے، ان کی اس بندہ عاجز کے ساتھ محبت اور دیرینہ گہرا تعلق تھا کہ ''چمنستان حدیث'' میں مستقل باب کی صورت میں میرا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ڈھائی تین ماہ قبل جب انہیں جامعہ سلفیہ میں استقبالیہ دیا گیا اور ان کی خدمات جلیلہ پر ایوارڈ پیش کیا گیا تو ان سے یہ آخری بالمشافہ ملاقات تھی، انھوں نے خوش کن خطاب فرمایا، جس سے طلباء اساتذہ اور شرکائے تقریب خوب محظوظ ہوئے، اس موقع پر ان کی تازہ ضخیم کتاب ''چمنستان حدیث'' کی رونمائی کی گئی۔

بھٹی صاحب سے پہلی ملاقات اپریل ۱۹۵۵ء کے آغاز میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنس منعقدہ دھوبی گھاٹ ہوئی تھی، جس کی صدارت مولانا سید محمد اسماعیل غزنوی نے فرمائی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان) کا معمول تھا کہ کسی بڑے پروگرام میں شرکت کے لیے وہ ایک روز پہلے تشریف لے آئے تھے، خاص طور پر مرکزی کانفرنسوں میں ان کا یہی انداز تھا، چنانچہ مولانا غزنوی ایک روز قبل شام کے وقت فیصل آباد تشریف لائے، آپ کے ہمراہ ایڈیٹر ''الاعتصام'' مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی تھے، جن کی اس زمانے میں بھرپور جوانی تھی، ''ابوالکلامی'' داڑھی، مونچھ اور سفید پاجامہ کے اوپر سیاہ واسکٹ میں ملبوس بھٹی صاحب سے متعارف ہوئے، ہم شبان اہل حدیث کے نوجوان بیس پچیس رفقاء کانفرنس کے انتظامات پنڈال اور اسٹیج وغیرہ کی آرائش اور ترتیب وتزئین میں مصروف تھے، انتظامی امور میں مولانا غزنوی نے ہمیں بہت سی ہدایات دیں، علماء کے قیام وطعام اور عام وخاص کی رہائش وکھانے کے سلسلے میں کئی ایک انھوں نے اصلاحات فرمائیں۔

بھٹی صاحب کو ہم شبان اہل حدیث کی تبلیغی سرگرمیوں اور تنظیمی کارگزاریوں کی روداد ''الاعتصام'' کے لیے بھجواتے رہتے تھے، وہ ان کو جلی سرخیوں اور بڑے صحافتی سلیقے سے شایع کرتے اور بذریعہ خط وکتابت حوصلہ افزائی بھی فرماتے، چند سال بعد بھٹی صاحب نے داڑھی بڑھا لی اور علمائے کرام کے ساتھ ان کی نشست و برخاست اور گفتگو میں مولوی پن کچھ اجاگر ہوا، جب کہ وہ جلیل القدر علماء سے فیض یاب اور درس نظامی کے فارغ التحصیل بھی تھے۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آیا جو خود بھٹی صاحب نے سنایا کہ ''ایک مرتبہ مجھے مولانا محمد حنیف ندوی اس دور کے نامی گرامی صحافی اور شاعر مولانا عبدالمجید سالک کے دفتر لے گئے انہیں ''الاعتصام'' کا تازہ شمارہ دیا اور میرے بارے میں کہا کہ یہ اس کے ایڈیٹر محمد اسحاق بھٹی ہیں، سالک صاحب نے الاعتصام اٹھایا اور مذاقاً کہا یہ تو ہوا ''الاعتصام'' اور میری داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہوئی ''حبل اللہ''۔ یاد رہے مولانا عبدالمجید سالک صاحب داڑھی مونچھ کے بغیر تھے، ہم نے کئی بار انہیں مشاعروں میں سنا، بلکہ مشاعروں کی صدارت بھی وہی کرتے تھے۔

دراصل مخلص دوست زندگی کا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے اور اس کی اس جہاں سے رخصتی نہ صرف قلب وذہن کو ہمیشہ کے لیے مغموم کر دیتی ہے بلکہ یادوں کی ایک بھاری گٹھری بھی ذہن پر لاد دیتی ہے، جس سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا، بھٹی صاحب کی کس کس خدمت ادبی وصحافتی، علمی وسیاسی اور نگارشات کا تذکرہ کیا جائے ان کی بہت بڑی دینی خدمت ''فقہائے ہند'' کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ برصغیر ہندوپاک کے بلند مرتبت علماء صلحاء کی سیرت وسوانح پر نصف صدی کے قریب تصانیف کہ جن کو ایک مرتبہ پڑھنا شروع کریں تو آخر تک پڑھے بغیر طبیعت سیراب

نہیں ہوتی، ان کی تحریروں میں روانی، شگفتگی، مختلف ادوار کے حالات وظروف میں علمائے اسلاف کی علمی وتدریسی تگ وتاز، کٹھن راہوں میں مشکلات ومصائب اور طویل ترین اسفار کا مستند تذکرہ کرنے میں کمال قلم چلایا ہے، یہی وجہ ہے ''جمعیت احیاء التراث الاسلامی'' کویت کی طرف سے ایک بڑے علمی ودینی اور رفاہی اجتماع میں بھٹی صاحب کو مورخ اہل حدیث کے خطاب سے نوازتے ہوئے ایک یادگار شیلڈ عنایت کی گئی۔ اس کام میں ہمارے فاضل دوست مولانا عارف جاوید محمدی کی کاوش خاص طور پر قابل ستائش ہے۔

بھٹی صاحب نے تو خیر علماء اہل حدیث کی نئی نسل کے لیے اپنے اسلاف کی محنتوں اور دینی جدوجہد کی تنظیمی کارگزاریوں سے آگاہی کا بہت سا مواد اپنی گراں قدر تصانیف میں جمع فرمادیا ہے۔ ہمارے اور اسلاف نے دعوت وارشاد کے سلسلہ کی جو مذہبی جماعتیں قائم کیں اور بڑی بڑی برصغیر کی تحریکوں میں سرفہرست اور سرفروشانہ کردار ادا کیا ان کی تفصیلات وکوائف کو دلچسپ اور خوبصورت پیرائے میں حوالہ قرطاس کیا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی ان کی فضیلت مآب شخصیات کے کردار وسوانح کو بھی تحریر میں لایا گیا ہے، گویا شاعر کی زبان میں اپنا مطمح نظر یوں بنالیا تھا۔

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

ہمارے ممدوح مرحوم بھٹی صاحب علمی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن ان کے آباء واجداد میں دینی صلاحیت اور زہد وتقوی نمایاں تھا، بھٹی صاحب کو بچپن سے مطالعہ کا شوق جو انہیں لڑکپن ہی میں ''مرکز الاسلام لکھوکے'' لے آیا، یہ مسلک اہل حدیث کا قدیمی اور قرآن وسنت کی تعلیمات کا گہوارہ تھا، جہاں انھیں مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا عطاء اللہ لکھوی جیسے اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا، جن کی تعلیم وتربیت اور مولانا محی الدین لکھوی ومولانا معین الدین لکھوی جیسے ہم سبق کی رفاقت نے انہیں کندن بنا دیا، یہاں تحصیل علم کے بعد تدریسی خدمات بھی کیں، بعض سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی بنا پر قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، یہاں تک کہ تقسیم ملک کے موقع پر دیگر مہاجرین کی طرح بے سروسامانی کی کیفیات میں لاہور آگئے، لاہور میں بقول بھٹی صاحب نئی منزل اور نئی راہیں آتی گئیں، مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تشکیل پر حضرت مولانا سید محمد داود غزنوی اور مولانا اسماعیل سلفی کی صحبت وبرکات اور راہنمائی میں مرکزی دفتر کے ناظم دفتر بھی رہے اور پھر نیم سرکاری ادارہ ثقافت اسلامیہ سے بھی منسلک رہے۔ یہاں مولانا محمد حنیف ندوی جیسے بلند مرتبت اور علمی اونچی شخصیات کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے ان کی صلاحیتیں کہاں سے کہاں تک بڑھتی رہیں، اس کا اندازہ ان کی تصانیف اور نگارشات سے ہوتا ہے، اس زمانے میں روزنامہ ''امروز'' بڑا مقبول اخبار تھا جس میں ہر دوسرے تیسرے روز بھٹی صاحب کے علمی وادبی اور سیاسی کالم ہم پڑھتے تھے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دنوں میں ریڈیو پر حضرت سید ابوبکر غزنوی اور مکرم مولانا محمد اسحٰق بھٹی کی تقریروں کو عوام میں بڑی پذیرائی حاصل رہی۔ ''الاعتصام'' کے اس دور کے پرجوش اور جہادی سپرٹ ابھارنے والے اداریے اسی طرح ملکی تحریکوں پر تبصرہ اور مسلکی تبلیغ پر مشتمل ادارتی تحریریں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلاشبہ بھٹی صاحب اردو زبان وادب کے ایک صاحب طرز ادیب اور خالص اسلوب نگارش کی حامل شخصیت تھے، ان کے قلم سے کافی مقدار میں تاریخی وتحقیقی کتابیں اور بے شمار مقالات زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں، انھوں نے ایک دفعہ کسی بات سے ناراض ہو کر الاعتصام کو چھوڑ کر اپنا ایک جریدہ سہ روزہ ''منہاج'' کے نام سے نکالا، ان دنوں وہ اور ہمارے دوست قاضی اسلم سیف میرے غریب خانہ پر تشریف لائے اور منہاج کی اشاعت بڑھانے اور خریدار لگانے کے لیے توجہ دلائی، دو تین روز ہمارے ہاں ان کے قیام کے دوران میں نے شہر میں بیس تیس خریدار بنائے، لیکن چند ماہ بعد منہاج نہ چلا اور وہ دوبارہ ''الاعتصام'' میں آگئے اور بعدہ کچھ مدت ''اہل حدیث'' کے مدیر اعلی بھی رہے، مجھے ان کے ساتھ اہل حدیث کے ادارتی عملہ میں شامل ہو کر کام کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ اس دوران کئی جماعتی نشیب وفراز آئے مگر ان کی محبتوں اور خوشگوار ملاقاتوں میں کوئی فرق نہ آیا، مولانا محمد اسحاق بھٹی یارانہ نبھانے اور دوستوں کی خوشیوں اور غموں میں شامل ہونے کے لیے تصنیفی مصروفیات میں سے وقت نکال لیتے، فیصل آباد میں ان کے ہم عمر اور بے تکلف دوستوں کا ایک مجمع تھا جن میں مولانا محمد اسحٰق چیمہ، مولانا محمد صدیق مولانا عبید اللہ احرار اور قاضی اسلم سیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، وہ جب بھی لاہور سے اپنے گاؤں منصور پور ڈھیسیاں (جڑانوالہ) آتے تو فیصل آباد ان دوستوں کو ملنے کے لیے اکثر آتے، مولانا عبید اللہ احرار کی دکان پر یا مولانا محمد اسحٰق چیمہ کی دکان پر محفلیں برپا ہوتیں، لطائف وظرائف ہوتے، جماعتی سیاسیات اور ملکی احوال زیر بحث رہتے، ادارہ علوم اثریہ میں علمی اجلاس ہوتے، جن میں مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور بھٹی صاحب لازمی شرکت کرتے۔ اب نہ وہ علمی شخصیات ہیں اور نہ وہ ماحول ہے، بس نفسانفسی کا دور ہے، بھٹی صاحب کے دنیا سے جانے کے بعد اب تو بالکل ہی اداسی کا سماں ہے، بزبان شاعر

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

بہر حال ہمارے بزرگ دوست مولانا محمد اسحٰق بھٹی علیہ الرحمہ کی نگارشات اور کتب کثیرہ ایک زندہ یادگار بن کر آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ عمل رہیں گی، اللہ تعالی ان کے حسنات کو قبول فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں صالحین واسلاف کے ساتھ اکٹھا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

# علم کا پہاڑ.... انکسار کا پیکر

مولانا رانا شفیق پسروری

لوگوں نے کسی پہاڑ کو لوگوں کے ہاتھوں پر رواں نہیں دیکھا ہوگا، مگر میں نے آج ایک پہاڑ کو روتے اور ہچکیاں لیتے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں پر سفر کرتے دیکھا ہے۔ میں نے اوروں کی طرح خود بھی اس کے جنازے کو کندھا دیا ہے، وہ پہاڑ ایک نحیف منحنی سے شخص کی صورت میں تھا، دیکھنے کو ایک دبلا پتلا، کمزور سا شخص، مگر اپنی ذات وصفات میں پہاڑوں سے بلند قد وقامت کا مالک، بلا مبالغہ اور حقیقتاً علم کا پہاڑ، عمل وکردار کا پیکر عظیم کہ جس کو دنیا مولانا محمد اسحاق بھٹی کے نام سے جانتی ہے۔ (اور اب ہمیشہ یاد کرتی رہے گی)

مولانا محمد اسحاق بھٹی نے نوے سال کی ایک لمبی زندگی بسر کی ہے، مگر زندگی مسلسل ''ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی'' کی مصداق رہی ہے، آخر دم تک ان کا تعلق قلم و قرطاس سے قائم رہا۔ ان کے عزیز اور احباب ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے انہیں آرام کی تلقین واصرار کرتے رہے مگر وہ پارہ صفت تھے اور زندگی کے لمحہ سے کچھ نہ کچھ کشید کرتے رہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک نوے سالہ بوڑھے کا وجود جوانوں سے زیادہ متحرک اور دماغ کم سنوں سے بڑھ کر قوت حافظہ سے لبریز ومعمور تھا۔

وہ کثیر التصانیف بھی تھے، کثیر المجالس بھی، عام طور پر لکھنے والے مردم بیزار ہوتے ہیں، تنہائی کو اپنے کام میں مدد ومعاون جانتے اور لوگوں سے میل ملاپ سے احتراز کرتے ہیں، مگر حضرت بھٹی صاحب ایک مجلسی آدمی تھے، یار باش، دوستی پالنے اور دوستی سنبھالنے والے، کوئی ان کو ملنے جاتا تو بانہیں اور دل کھول کر ملتے، کسی کو اجنبیت کا احساس تک نہ ہونے دیتے، ہر ایک کی ذہنی سطح تک آ کر ملتے کہ زندگی بھر کے لیے اپنا نقش چھوڑ جاتے، ملنے والا خود اجازت چاہ کر اٹھتا، دل کھول کر باتیں کرنے والے اور پوری طرح متوجہ ہو کر سننے والے، بھٹی صاحب لکھتے بھی بہت زیادہ تھے۔ اتنا لکھتے تھے کہ کتاب پر کتاب شائع ہوتی چلی جاتی تھی۔ ان کے ملنے والے حیران ہوتے تھے، یہ مجلسی آدمی لکھتا کس وقت ہوگا کہ اس کمال کا لکھ گیا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی نے تفسیر وحدیث، فقہ وسیرت، تاریخ وادب پر بھی خود لکھا مگر ان کو جو شہرت ودوام ملی وہ ان کو خاکہ نویسی کے حوالے سے ملی ہے، گویا وہ اس فن کے امام تھے شخصیات پر انہوں نے جتنا زیادہ لکھا اور جس قدر لکھا برصغیر کی تاریخ میں کسی اور نے کہاں لکھا ہوگا، ان کے کام کی کثرت وندرت کے باعث ہی تو انہیں کویت کے عرب علمی شخصیات نے ''ذہبیٔ دوراں'' کے لقب کے ساتھ اعزازات سے نوازا تھا۔

وہ شخصیات پر لکھتے تو اس طرح لکھتے کہ پڑھنے والا یوں سمجھتا کہ وہ تحریر نہیں پڑھ رہا کوئی فلم دیکھ رہا ہے، وہ جزئیات تک لکھ جاتے۔ اللہ کریم نے انہیں حافظہ بھی بلا کا عطا فرمایا تھا، عرصہ دراز گزرنے کے باوجود بھی جس پر لکھتے، لگتا کہ وہ سامنے حرکت کر رہا ہو۔ میں نے پیغام ٹی وی کے لیے ان سے ۱۸ گھنٹہ پر مشتمل طویل انٹرویو کیا، عنوان تھا: ''گاہے گاہے باز خواں''۔ کوئی طے شدہ سوالات نہیں تھے، بس سیٹ پر بیٹھے رواں ہو گئے۔ میں سوالات کرتا اور فوراً جواب میں تاریخ انڈیلنے لگتے اور اس روانی اور سلاست سے کہ ''ہم پر کوئی حیرانی سی حیرانی ہے'' والی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ اپنے ایک سفر دہلی کی بات کر رہے تھے کہ میں نے بات کاٹ کر پوچھ لیا کہ آپ کی مولانا شرف الدین دہلوی سے بھی ملاقات ہوئی؟ وہ ایک لمحہ ہچکچائے بغیر فرمانے لگے۔

ہاں ۱۹۴۲ء کی بات ہے، بدھ کا دن تھا، فلاں مہینے کی فلاں تاریخ، ہم ان کو ملے تو وہ گلاس میں دودھ ڈال کر اس میں روٹی کے لقمے توڑ کر، بھگو بھگو کر کھا رہے تھے، پھر ہمارے لیے بھی منگوایا اور ہمیں بھی اپنے طعام میں شریک کر لیا۔ کسی واقعہ کو پون صدی گزر جانے کے باوجود سن تاریخ دن کے ساتھ ساتھ تمام جزئیات اور پوری باریکیوں کے ساتھ یاد رکھنا اور پھر لکھنا انہیں کا کمال تھا۔

بھٹی صاحب عجز وانکسار کا حقیقی پیکر تھے۔ اتنی بڑی علمی شخصیت ہونے کے باوجود کبر ونخوت ذرا سی بھی نہ تھی، کسی بھی ملنے والے پر اپنی علمیت کا رعب نہ ڈالتے تھے نہ اسے احساس ہونے دیتے کہ وہ کتنی بڑی شخصیت کے سامنے ہے۔ ان کی بود وباش عام سی اور بڑی سادہ تھی، میں نے انہیں بارہا فٹ پاتھ پر پڑی کتابوں کے پاس بیٹھے اور کتابیں چنتے دیکھا ہے۔ پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کیا تو میں نے ''اسلام اور جمہوریت'' کتاب لکھی تو اس کا مقدمہ مولانا بھٹی صاحب نے لکھا، پھر ۱۶ دسمبر ۱۹۹۹ء کے روز پریس کلب میں کتاب کی تقریب پذیرائی نواب زادہ نصر اللہ خاں مرحوم کی صدارت میں ہوئی، بھٹی صاحب بھی تشریف فرما تھے، ہم زور لگا لگا کر رہ گئے، مگر مولانا اسٹیج پر تشریف فرما نہ ہوئے، حالانکہ وہاں جو بھی بڑے تھے مائک پر آ آ کر بھٹی صاحب سے خوشہ چینی کا اعتراف کر رہے تھے۔

وہ حقیقتاً بے غرض تھے، ساری زندگی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا، وہ اپنی کتابوں کے ناشرین کے خزانے بھر گئے ہوں گے، مگر ان کا اپنا گھر ایک چھوٹی سی گلی میں، چھوٹا سا ہی رہا۔ انھوں نے اپنا نام، اپنے کام کے بل بوتے پر پیدا کیا، حالانکہ وہ نام کے لیے کام نہیں کرتے تھے، وہ تو شخصیات سے محبت کرتے تھے، اخلاص سے ان کو گمنامی سے نکال کر نمایاں کرتے تھے، ان کے اخلاص اور دل سے لکھنے کے وصف کے باعث قدرت نے ان کو آسمانِ علم ومعرفت کا تابندہ ستارہ بنا دیا ہے۔ (بقیہ ص: ۳۶/پر)

# علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا

مولانا عبدالرؤف خان ندوی (تلشی پور)

برصغیر کے ممتاز عالم دین، مشہور اسکالر اور مصنف وادیب علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کو انتقال ہوئے ۱۰/ماہ ہو رہے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ابھی کل کا واقعہ ہے۔ کئی ماہ گزرنے کے باوجود ان کی یاد آتی ہے اور رنجیدہ وغمگین کر جاتی ہے۔

آپ کی وفات سے برصغیر کی تاریخ کا ایک عظیم باب بند ہو گیا۔ علامہ بھٹی ۱۵/مارچ ۱۹۲۵ء کو کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام میاں عبدالمجید بھٹی اور دادا کا اسم گرامی میاں محمد تھا۔ آپ کے دادا صاحب دین دار تقوی صالحیت کے زیور سے آراستہ تھے، ان کے قلب وذہن پر اسلامی تعلیمات کے گہرے نقوش ثبت تھے۔ علامہ بھٹی اپنے دادا کی سرپرستی ونگرانی میں تعلیم کے اعلی مدارج کو عبور کیا۔ علامہ بھٹی علامہ محمد عطاء اللہ حنیف شاہ بھوجیانی وعلامہ محمد اسماعیل سلفی محدث گوجرانوالہ حافظ محمد گوندلوی کے شاگرد اور متکلم اسلام علامہ حنیف ندوی، مولانا شاہ جعفر پھلواری، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا رئیس احمد جعفری ندوی رحمہم اللہ کے رفقاء خاص میں سے تھے۔

علامہ نے آزادی کی تحریک میں بھی بھرپور حصہ لیا اور فرید کوٹ جیل میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ آپ ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کے سکریٹری رہے جس کے صدر گیانی ذیل سنگھ تھے جو بعد میں ہمارے ملک کے صدر جمہوریہ بنے۔ علامہ کا علم پختہ اور حافظہ قوی تھا، ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں لوگوں اور جماعتی تاریخ کے بے شمار واقعات ان کے لوح ذہن پر نقش تھے۔ علامہ کی باغ وبہار ودلاویز شخصیت کا رنگ ان کی تحریروں میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک عظیم قلمکار، صاحب دانش بزرگ، بہت سے جماعتی وملی اہم رازوں کے امین، اسلاف کی تابناک روایات واقدار کے نگہبان، سلفی تاریخ کے پاسبان اور جماعتی تاریخ کا انسائیکلوپیڈیا تھے۔

علامہ بھٹی رحمہ اللہ کے حادثۂ وفات سے صفِ علماء میں بڑا خاص خلا پیدا ہوا ہے۔ بھٹی صاحب نے گو طبعی عمر پائی تاہم ان کی وفات ہم سب کے لیے غیر متوقع تھی، لیکن موت کا ایک وقت مقرر ہے ہر شخص ان کی جدائی سے غمگین ورنجیدہ ہے، موت کے علاوہ کوئی اور مصیبت ہوتی تو اس کی چارہ سازی بھی ہو جاتی لیکن ''کل من علیها فان'' کا حکم سب پر نافذ ہے۔

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

تحریک اہل حدیث کے علمبردار اور قدیم وجدید کے درمیان ہر دلعزیز علامہ بھٹی کی ذات گرامی تھی، جو ملا اور مسٹر دونوں میں محبوب اور ان دونوں کی زبان سے واقف دونوں کے طرز فکر سے آشنا اور دونوں کی مجلسوں میں یکساں مقبول تھے، اس گلستاں نما خزاں آباد کے ۹۱/بہاریں ان کی آنکھوں نے دیکھیں، ان کی ضخیم کتابوں کے اوراق ہماری مذہبی، سیاسی، اخلاقی، ثقافتی، معاشرتی اور تعلیمی انقلابات کی تاریخ سے پر ہیں۔

اس عظیم شخصیت سے میرے عرصہ سے خوش گوار تعلقات تھے، مجھ پر ہمیشہ بزرگانہ شفقت فرماتے، اللہ کی توفیق سے سال میں ایک بار میری قلمی کاوش چھپ کر منظر عام پر آتی جسے برابر آپ کی خدمت عالیہ میں بھیجتا رہتا تھا، آپ بذریعہ فون اور خط ہمت افزائی فرماتے اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازتے۔ علامہ بھٹی کی ترغیب وتشویق پر ناچیز نے اپنے ملک ہندوستان کے ممتاز سلفی علماء کی سوانح حیات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا، الحمدللہ تین جلدیں بنام ''کاروانِ سلف'' منظر عام پر آچکی ہیں، چوتھی جلد زیر ترتیب ہے تیسری جلد پر علامہ بھٹی کا ایک جامع مقدمہ ہے کتاب کاروان سلف جب آپ کی نظر سے گزری تو ناچیز کی بذریعہ خط ہمت افزائی فرمائی اور انتہائی مسرت کا اظہار فرماتے ہوئے مبارکباد دی۔

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مجھ ہیچمداں کا اپنی مشہور کتاب ''چمنستانِ حدیث'' میں کئی صفحات پر تذکرہ فرمایا۔ اللہ آپ کو غریق رحمت کرے آمین۔

بھٹی صاحب توحید خالص کے داعی، صحیح عقیدہ کے ناشر اور کتاب وسنت کے ہمہ وقتی مبلغ تھے۔ بھٹی صاحب ایک نام نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے، وہ محی السنۃ وقامع البدعۃ تھے، شرک وبدعات کے خلاف ایک طوفان تھے، ایک آندھی تھے ایک زلزلہ تھے۔ آپ نوجوانان امت مسلمہ کو منہج سلف صالح کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔ بھٹی صاحب دریا کے موج کی طرح متحرک سکون وقرار سے ناآشنا ہر وقت مصروف عمل اور ہر وقت آپ کا قلم چلتا رہتا تھا، افسوس کہ وہ قلم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

بھٹی صاحب بہت سی خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے، کن کن کا ذکر کیا جائے، بھٹی صاحب جہاں بہت اچھے مربی، بہت اچھے مدرس، بہت اچھے عالم باعمل تھے، وہیں بہت اچھے مورخ بھی تھے۔ آپ تقریباً ساٹھ کتابوں کے مصنف تھے جو سیکڑوں علماء کرام ودانشوروں کی سیر وسوانح کو خون جگر سے رقم کی، جو پچاس ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، (بقیہ ص:۵۳ پر)

# مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ کی خوراک (جسمانی، روحانی اور قلمی)

ڈاکٹر عبدالغفور راشد (پاکستان)

زندہ رہنے کے لیے ہر انسان کو خوراک کی لازمی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کے بغیر زندگی کی گاڑی کا پہیہ چلنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ چنانچہ ہر انسان حسب توفیق، حسب ضرورت یا پھر حسب موقع سادہ یا پرتکلف، کم یا زیادہ خوراک استعمال کرتا ہے جس سے اس کے بدن کو توانائی دستیاب ہوتی ہے اور پھر اس کا جیون اپنا سفر جاری رکھتا ہے اس کے ساتھ ہی انسان کو اپنی روح کے لیے بھی خوراک درکار ہوتی ہے، جسے وہ اپنی تربیت اور ماحول کے مطابق اختیار کر لیتا ہے، اگر اس کی تربیت دینی بنیادوں پر ہوئی اور پھر اسے ماحول بھی مناسب میسر آ گیا تو یقیناً اس کی روحانی خوراک اللہ کا ذکر اور اس کی بارگاہ میں رکوع و سجود ہی ہوگی اور اگر بدقسمتی سے تربیت و ماحول اس کے برعکس ملا تو پھر موسیقی کو اپنی روح کی غذا اور رقص و سرود کی محفلوں کو ہی اپنی زندگی سمجھے گا اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دنیوی مشاغل کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیتے ہیں اور اس جستجو میں جیون بھر سرگرداں رہتے ہیں اور انہیں اسی حالت میں خالق حقیقی کی طرف بلاوا آ جاتا ہے اور انہیں اپنی اصلاح و فلاح کا کوئی موقعہ نہیں ملتا ہے۔

اس لحاظ سے ہمارے ممدوح و مخدوم مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ بڑے بلند اور خوش قسمت انسان تھے ان کی زندگی کے معمولات و ماکولات، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک بلکہ آخری دم تک نہایت شاندار تھے ان کی خوراک تین قسم کی تھی، بدنی، روحانی اور قلمی، ذیل کی سطور میں مرحوم کی تین غذاؤں سے متعلق چند گزارشات اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

## ۱۔ جسمانی خوراک

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کو زندگی میں جس طرح لباس کے معاملے میں بالکل سادہ دیکھا گیا اسی طرح انہیں خوراک کے معاملے میں بھی سادہ ہی پایا گیا، وہ قطعی طور پر بسیار خور اور خوش خوراک نہیں تھے بلکہ جو بھی رزق حلال آیا اسے اللہ کا نام لے کر کھا لیا اور پھر مسنون طریقے سے اللہ کا شکر ادا کیا، زندگی میں کئی بار ان کے ساتھ کھانے کا موقع ملا، ساتھ میں سفر بھی کیا اور انہوں نے مہمان نوازی کی سعادت بھی بخشی مگر کبھی بھی کسی خاص اور اسپیشل کھانے کی خواہش نہیں کی اور نہ ہی کبھی کھانے میں کوئی نقص نکالا۔ ہمیں یاد رہنا چاہیے کہ ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کبھی کھانے میں عیب اور نقص نہیں نکالتے تھے دسترخوان پر موجود کھانا نہ کھانا ہوتا تو آپ ﷺ اپنا دست مبارک آگے نہ بڑھاتے مگر عیب جوئی بھی نہ فرماتے، ہمارے مولانا بھٹی مرحوم بھی گھر میں یا احباب کے ہاں جو ملتا ضرورت کے مطابق کھا لیتے، بسیار خوری ویسے بھی اہل دانش کے ہاں ناپسندیدہ تصور کی جاتی ہے کیوں کہ حضور ﷺ کی تعلیم تو یہ ہے کہ کھانا بھوک رکھ کر کھانا چاہیے اور مولانا کا قول ہے کہ ''خوردن برائے زیستن نہ کی زیستن برائے خوردن است'' یعنی کھانا جینے کے لیے ہے، جینا کھانے کے لیے نہیں ہے۔

## ۲۔ روحانی خوراک

ہر مسلمان کی روحانی خوراک اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی بارگاہ میں سجدہ و رکوع ہے اس سے دلوں کو قرار ملتا ہے، روح کو تازگی ملتی ہے اور خیالات کو جلا ملتی ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: ''الا بذکر اللہ تطمئن القلوب'' خبردار! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

انبیاء کرام اور سلف صالحین بھی اسی عمل پر کاربند رہے، ہمارے ممدوح مولانا بھٹی بھی اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے اپنے دل کو قرار اور اپنی روح کو تازگی بخشتے تھے پانچ وقت کی نماز کی ادائیگی کے ساتھ شب بیداری اور صبح خیزی ان کا معمول تھا اور یہ معمول ان کا بچپن سے تھا کیوں کہ ان کی تربیت ان کے دادا جان مرحوم نے کی تھی۔ وہ ابھی نوعمر ہی تھے کہ ان کے دادا جان نماز فجر کے لیے مسجد میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے بلکہ کبھی کبھی ان سے فجر کی اذان بھی کہلواتے اور نماز فجر باجماعت ادا کرتے، اس سارے کام کے لیے فجر سے پہلے بیدار ہونا پڑتا ہے بلکہ دادا جان نے ان کی تربیت کے لیے بچپن میں ہی انہیں بڑے پاک طینت علماء سے ملوایا، ان سے دعا کروائی اور ان کے حلقہ بیعت و ارادت میں شامل کروایا۔ مولانا بھٹی نے خود لکھا ہے کہ ایک دفعہ بڑے ہی صاحب تقوی و ورع بزرگ عالم دین سید محمد شریف گھڑیالوی انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ میں شرکت کے لیے کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ تشریف لائے تو میرے دادا جان مجھے ان کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا کہ میرے اس بچے کو اپنی بیعت میں شامل کر لیں اور دعا بھی فرمائیں، چنانچہ سید صاحب نے مجھے حلقہ بیعت میں شامل کیا، دعا فرمائی اور چند نصیحتیں بھی کیں جب کہ میری عمر اس وقت دس بارسال تھی۔

مولانا بھٹیؒ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد میرے استاذ گرامی مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے مجھے صاحب کمال بزرگ مولانا کمال الدین ڈوگر کے حلقہ بیعت میں بھی شامل کروا دیا، وہ بھی بڑے صاحب زہد و تقوی انسان تھے، ان کی خشیت کا ایک واقعہ راقم الحروف نے اپنی کتاب ''تذکرہ الابرار'' میں درج کیا ہے۔ والدین اپنی اولاد و احفاد کی تربیت بڑے ہی خوبصورت انداز میں کرتے تھے یہ ہماری تہذیب اور ہمارے کلچر کا حصہ تھا اپنے بچوں کو اپنے ساتھ نماز فجر

کے لیے مسجد میں لے جانا اور پھر بچوں کا اسکول جانے سے پہلے مسجد میں قرآن مجید اور دیگر ابتدائی دینی کتب پڑھنا، اسکول سے واپسی پر شام کو مسجد میں مسنون دعائیں اور دینی آداب سیکھنا اور رات کو اپنے دادا، دادی یا نانا نانی کی صحبت میں انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے واقعات سن کر دینی رغبت حاصل کرنا ہمارے کلچر کا حصہ تھا، اب تو زندگی مشینی ہوگئی ہے ہمارے بڑوں کو دفاتر سے اور بچوں کو اسکول اور ٹیوشن سے ہی فرصت نہیں اور اگر وقت بچ گیا تو وہ کمپوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل پر نیٹ فیس بک اور واٹس اپ ٹویٹر اور چاٹنگ کی نذر ہوجاتا ہے، بڑوں کو چھوٹوں کی رفاقت ومعاونت کی ضرورت نہیں رہی، ایسے ماحول میں جو قوم تیار ہوگی اس کا بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

مولانا بھٹیؒ کا معمول تھا کہ نماز فجر سے پہلے بیدار ہوتے حسب توفیق نوافل کی ادائیگی کے ساتھ کم از کم نصف پارہ قرآن مجید کی تلاوت کے بعد مسجد میں تشریف لے جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے، اگر کسی وجہ سے تلاوت نہ کرسکتے تو سارا دن اندیشہ رہتا، ہر نماز کے بعد دس مرتبہ ''رب اشرح لی صدری ویسر لی امری احلل عقدة من لسانی یفقھو قولی ''اور دس مرتبہ لاحول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم ،اور تین مرتبہ رب زدنی علما پڑھتے، ننگے سر نماز پڑھنا جائز سمجھتے لیکن معمول کو پسند نہیں کرتے تھے، نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا لازم نہیں سمجھتے تھے مگر وہ اکثر یہ عمل کرتے تھے خندہ پیشانی اور خوش گوئی انہیں بہت محبوب تھی۔

## ۳۔ قلمی خوراک

مولانا بھٹیؒ جنھیں علمی دنیا مؤرخ اہل حدیث کے نام سے جانتی ہے، جسمانی اور روحانی خوراک کے ساتھ قلمی خوراک بھی ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکی تھی انہوں نے خاکہ نویسی سے لے کر تحقیقی مضامین تک زندگی بھر تحریر کے تمام میدانوں میں ایک ماہر اور مشاق شہسوار کی طرح شہسواری کی، ان کی تحریر کا انداز بڑا سادہ مگر دلکش تھا، ان کی تحریر کو پڑھتے ہوئے جس طرح قاری محسوس کرتا ہے وہ ساتھ ہی ساتھ خود کو بھی اس میں شامل سمجھتا ہے اور یہ ان کی تحریر کی بڑی کمال کی خوبی ہے۔ محبت سے جی بھر کے لکھا وہ اپنی مجلسوں میں فرمایا کرتے تھے ہم نے شخصیت پرستی سے پرہیز کرتے کرتے شخصیت فراموشی شروع کردی ہے جو مناسب رویہ نہیں ہے۔ انہوں نے قومی سطح کی نمایاں شخصیات کے ساتھ گمشدہ اور فراموش کردہ شخصیات پر بھی لکھا اور اس انداز میں لکھا کہ انہیں تاریخی صفحات میں زندہ کردیا۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ لکھنا ان کا فعل وشغل نہیں بلکہ ان کی خوراک وغذا بن چکا تھا، اللہ تعالیٰ نے انہیں طویل العمری کے باجود صحت وتندرستی، بصارت وبینائی، بصیرت و شناوری، خندہ پیشانی وخوش گوئی اور کمال کے حافظے سے نوازا تھا اور ان خوبیوں کے ساتھ تادم واپسیں چاک وچوبند بھی تھے آخری ایام تک قلمی خوراک سے بہرور ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی علمی باقیات صالحات کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

☆☆☆

(ص:۵۷/ کا بقیہ) مگر اسحاق صاحب ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔

آپا مریم جمیلہ فوت ہوئیں تو ان کے جنازے میں بھی شریک ہوئے اور بعد میں آپا مریم جمیلہ پر ایک تحریر بھی عنایت فرمائی جو مختلف جرائد میں چھپی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے ایک نئی دینی جماعت بن رہی ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ جماعت اسلامی کا دستور بڑا بہترین ہے وہ مجھے لادو تو پھر میں نے دستور کی پانچ کاپیاں انہیں دے دیں۔

جب ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تھے تو جماعت کرواتے تھے۔ وہ بڑے وسیع القلب انسان تھے۔ یہی ان کی عظمت تھی۔ مولانا مودودیؒ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ جماعت اسلامی کو مولانا مودودیؒ جیسا امیر نہیں ملے گا جو تقریریں بھی کرتے تھے، کتابیں بھی لکھیں، تفسیر بھی لکھی، جماعت کو بھی چلایا، سیاست میں بھی حصہ لیا۔ علمائے کرام سے بھی تعلقات رکھے۔

میں اکثر ان سے کہتا تھا کہ اسحاق نامہ کب آئے گا تو وہ کہنے لگے : پہلے شہاب نامہ آیا پھر طفیل نامہ آیا اس لیے آپ یہ کہہ رہے ہیں۔

مولانا اسحاق صاحب نے بہت سی کتب تحریر فرمائیں۔ چند یہ ہیں : نقوش عظمت رفتہ، کاروان سلف، مولانا محی الدین لکھوی وغیرہ۔ وہ مؤرخ اہل حدیث تھے اور مورخ جماعت اسلامی بھی تھے جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب ہفت اقلیم میں کیا، اختلاف بھی کیا اور اعتراف بھی کیا۔

مولانا مودودیؒ کے دور میں مجلس شوریٰ میں ان کی رائے کے خلاف فیصلے ہوئے۔ پھر بھی انہوں نے اس اختلاف کو قبول کیا۔ مولانا عبدالرحیم اشرفؒ جماعت اسلامی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تو ایک تنظیم بنائی۔ اس کے پہلے اجلاس میں جو فیصلے ہوئے تھے وہ دوسرے اجلاس میں اس پر عملدرآمد کا تقاضا کررہے تھے۔ تو ایک بندے نے تنگ آکر انہیں کہا کہ میں تمہیں باہر اٹھا کر پھینک دوں گا تو مولانا عبدالرحیم اشرفؒ کے الفاظ تھے کہ وہ مولانا مودودی ہی تھے جو ہمیں برداشت کرتے تھے۔ یہی خوبی مولانا مودودیؒ کی عظمت کی نشانی تھی۔

محمد یوسف خان شوہر مریم جمیلہ صاحب سے بھی ان کے اچھے مراسم رہے تھے۔ وہ بھٹی صاحب کو ملنے ادارہ ثقافت اسلامیہ کتابوں کے تبادلے کے سلسلے میں ملنے جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ بڑی بے تکلفی بھی تھی اسحاق صاحب کی۔ محمد یوسف خان انہیں کہتے تھے کہ میں مریم جمیلہ والا یوسف خان ہوں۔

مولانا اسحاق بھٹی صاحب اب ہم میں نہیں رہے مگر وہ میرے جیسے ہزاروں دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین ثم آمین!

☆☆☆

# علامہ محمد اسحاق بھٹی: ماہ وسال کے آئینے میں

عبدالمبین ندوی

**ولادت:** ۱۵ مارچ ۱۹۲۵ء (ننہال میں) ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں میں ہوئی۔

**پرورش:** خاندانی تعلق کوٹ کپورہ (فریدکوٹ) مشرقی پنجاب میں ہوئی۔

**تعلیمی مراحل:** ۱۹۳۳ء سے قبل اپنے دادا سے قرآن مجید وار دو کی تعلیم لی۔

۱۹۳۴ء میں پانچویں جماعت میں پہونچے۔

**مناظرہ فیروزپور:** بعمر ۱۱ سال ۱۹۳۵ء میں مولانا امرتسریؒ کا مناظرہ سنا۔

۱۹۳۷ء میں مرکز اسلام میں مولانا بھوجیانی کے حلقۂ درس میں تھے۔

۱۹۳۹ء میں مولانا آزاد کی موچی دروازہ لاہور میں پہلی بار تقریر سنی۔

**دیگر اساتذہ:** مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا حافظ محمد گوندلوی (م ۱۹۸۵ء) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ۔

**قلمی تربیت:** مولانا عطاء اللہ بھوجیانی، مولانا محمد داود غزنوی اور محمد حنیف ندوی (م ۱۹۸۷ء) سے حاصل کی۔

**وہ شخصیات جن سے متاثر ہوئے:** علاوہ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری صاحب رحمۃ للعالمین، مولانا ابوالکلام آزاد سے بے حد متاثر تھے۔

**تدریسی خدمات:** مارچ ۱۹۴۳ء تا جون ۱۹۴۷ء مرکز اسلام لکھوکے میں معلم۔

**آزادئ ملک کے حصول میں قید و بند کی صعوبتیں:** اسی دوران آزادئ وطن کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا، فریدکوٹ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔

دوسری بار ۱۹۴۶ء میں پنجاب میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہوگیا، سول نافرمانی کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ اہل حدیث لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو (صدر پنجاب کانگریس) اور پنڈت جواہر لال نہرو کی والی پنجاب ہرندر سنگھ کے پاس مداخلت سے رہا ہوئے۔

☆ ۴۵-۱۹۴۶ء میں پرجا منڈل کے سیکریٹری رہے۔

**مولانا آزاد سے پہلی ملاقات:** ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ہوئی۔

**تقسیم ملک اور مولانا بھٹی:** ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک تقسیم ہوگیا تو ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۳۰ افراد کے قافلے کے ساتھ قصور ہوتے ہوئے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں منصور پور میں سکونت پذیر ہوئے۔

**مرکزی جمعیت اہل حدیث سے وابستگی:** ۲۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو جب مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے قیام میں ساتھ تھے۔ مولانا بھوجیانی اور مولانا سلفی کی ایما پر ناظم دفتر بنائے گئے۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک تقریباً ۱۶ سال باقاعدہ مرکزی جمعیت سے وابستہ رہے۔

**میدان صحافت میں:**

**نائب مدیر الاعتصام:** ۱۹ اگست ۱۹۴۹ء تا ۱۴ مئی ۱۹۵۱ء۔

**مدیر الاعتصام:** ۱۵ مئی ۱۹۵۱ء، اس دوران آپ نے الاعتصام کے کئی خاص نمبر شائع کیے۔ مثلاً:

''حجیت حدیث نمبر'' فروری ۱۹۵۶ء۔

''۱۸۵۷ء نمبر'' دستاویزی نمبر اور آئین نمبر۔

بڑے سائز کے سولہ صفحات کے اخبار کے خود ہی خاک روب، کلرک، مینیجر، پروف ریڈر وایڈیٹر تھے۔ یعنی خود ہی کوزہ وگلِ کوزہ وکوزہ گر تھے۔

**سہ روزہ منہاج:** جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنا ذاتی اخبار جاری کیا، جو اپریل ۱۹۵۹ء تک جاری رہا۔ ''سہ روزہ امروز'' میں کئی سال تک کالم نگار رہے، نیز روزنامہ پاکستان اور ماہنامہ قومی ڈائجسٹ میں بھی عرصہ تک لکھتے رہے۔

**الاعتصام سے استعفیٰ:** تقریباً ۱۵ سال الاعتصام سے وابستگی کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو ادارت سے مستعفی ہوگئے۔

**ہفت روزہ توحید:** سید ابوبکر غزنوی کے ساتھ مل کر ''توحید'' جاری کیا۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس سے بھی سبکدوش ہوگئے۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ میں بھی اسی اثناء میں ۳۲، ۳۳ مقالات شائع ہوئے۔

**ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی:** ۱۹۵۰ء میں یہ نیم سرکاری ادارہ خلیفہ عبدالحکیم کی نگرانی میں قائم ہوا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں ریسرچ کی حیثیت سے منتخب ہوئے، ادارہ برصغیر کے نامور محققین مثلاً مولانا محمد حنیف ندوی، سید جعفر شاہ پھلواروی، شیخ محمد اکرام رئیس احمد جعفری وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ۳۲ سال تک اس ادارہ سے وابستہ رہے۔

**مدیر المعارف:** جنوری ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ ''المعارف'' کے مدیر بنے اور ۲۲ سال تک علمی دینی موضوعات پر لکھتے رہے۔

موصوف سے راقم کی ۹۰ کی دہائی میں سفر پاکستان پر ملاقات ہوئی، موصوف جس بزرگانہ شفقت سے ملے تھے اس کی یاد آج تک تازہ ہے۔ اس وقت میں موصوف کی ہمہ جہت شخصیت سے بہت زیادہ واقف نہیں تھا البتہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رشتہ سے ''فقہائے ہند'' کے مصنف واسکالر کی حیثیت سے ضرور جانتا تھا۔ دارالمصنفین کے بعض اہم مخطوطات پر ''ماہنامہ المعارف'' میں میرا مضمون شائع کیا، جس کے صلہ میں ''المعارف'' آج تک گھر پر آرہا ہے۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی کے بعد آپ کے اشہب قلم سے علمی وتحقیقی قدیم کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ چند اس طرح ہیں:

۱۔ الفہرست از محمد بن اسحاق بن ندیم بغدادی (م ۳۹۱ھ) یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں

ادارہ سے آپ کے ترجمہ وتحقیق سے شائع ہوئی۔

۲۔ ''فقہائے ہندو پاک'' یہ اہم گراں قدر تصنیف دس جلدوں اور تین ہزار چھ سو پچاس صفحات پر مشتمل ہے، جس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کے فقہاء کا تذکرہ ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں نادر کتاب ہے جس کے متعدد ایڈیشن ہندو پاک سے نکل چکے ہیں۔

ٹی وی، ریڈیو پروگرام: ۲۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے مولانا بھٹی کی پہلی تقریر نشر ہوئی۔ اس کے بعد (زندہ تابندہ) کے عنوان سے مسلسل ۴۵ دنوں تک اہم اہل حدیث شخصیات کا تذکرہ نشر کیا۔

بھٹی صاحب کا ۲۷ جولائی ۱۹۷۲ء کو ٹی وی پر ''بصیرت'' کے عنوان سے پہلا پروگرام نشر ہوا، اس کے بعد پھر بار ہا پروگرام پیش کیے۔

**زیارت ہند کی خواہش:**

گیانی ذیل سنگھ مولانا بھٹی کے دوست بھی تھے اور ہم وطن بھی۔ بھٹی صاحب نے ہندوستان آنے کا خیال کیا تو انھوں نے پاکستان میں واقع ہندوستانی سفارت خانے کو حکم دیا کہ وہ آنا چاہیں تو ان کے ساتھ تعاون کریں۔ سفارت خانہ کے عملہ نے ویزا لگانے کے لیے پاسپورٹ طلب کیا مگر بھٹی صاحب نے اس پیشکش سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

۱۹۸۹ء میں ارمغان حنیف شائع ہوئی مولانا حنیف ندوی ان کے استاذ بھی تھے اور چالیس سالہ دیرینہ رفاقت بھی تھی، جس کا اس میں تذکرہ ہے۔

۱۹۹۰ء میں جناب ارشد علی صاحب فیصل آباد کے ساتھ آنے کی دعوت اس وقت کے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلی مولانا عبدالوہاب خلجی نے دی مگر یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

**علمی وسیاسی شخصیات سے ملاقات:**

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا ابوالاعلی مودودی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، علامہ ثناء اللہ امرتسری، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارکپوری، مولانا عبدالوہاب آروی، حکیم اجمل خاں، شیخ عبداللہ کشمیری، خان عبدالغفار خان، جواہر لال نہرو، گیانی ذیل سنگھ وغیرہم سے بھٹی صاحب کی اچھی ملاقات رہی۔

**ادارہ ثقافت اسلامیہ سے سبکدوشی:** ۱۶ مارچ ۱۹۹۶ء کو ۳۲ سال بعد ہوئی۔

**حج بیت اللہ کی سعادت:** ۲۰۰۰ء میں پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

**خدمات علمیہ کے صلہ میں اعزازات وانعامات:**

☆ ۲۷ اگست ۲۰۰۵ء میاں طاہر محمد نے اپنے قائم کردہ ادارہ ''مرکز الحرمین الاسلامی'' فیصل آباد کی طرف سے تصنیفی خدمات کے اعتراف میں شیلڈ پیش کیا۔

☆ ۱۴ اگست ۲۰۰۵ء کو گجرات (پاکستان) میں حافظ عبدالستار عاصم (لندن) حافظ طارق محمود ودیگر حضرات نے یہاں صوفی ریسٹورنٹ ہال میں شیلڈ سے نوازا۔

☆ ۲۷ مارچ ۲۰۰۶ء کو تعلیمی ادارہ مرکز ابن خطاب الہ آباد ضلع قصور میں مولانا اکبر سلیم کی کوششوں سے تقریب انعام کا اہتمام کیا گیا اور بدست مولانا محمد یوسف راجووالوی شیلڈ دی گئی۔

☆ ۱۴ اگست ۲۰۰۷ء کو ڈاکٹر عبدالرحمن پریوائی (ریاض) نے اپنے والد کے نام پر ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا مگر ویزا نہ ملنے کی وجہ سے ہندوستان تشریف نہ لا سکے۔

**ادائیگی عمرہ:** جون ۲۰۰۸ء میں عمرہ کی سعادت حاصل کی۔

**سفر کویت:** مرکز دعوۃ الجالیات کی دعوت پر اواخر جون میں ۲۰۰۸ء کو کویت کا سفر کیا۔

**مؤرخ اہل حدیث کا خطاب:**

۳ جولائی ۲۰۰۸ء کو جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی قرطبہ کے ہال میں مولانا بھٹی کو استقبالیہ پیش کیا گیا اور صدر جمعیۃ شیخ طارق عیسی حفظ اللہ کے بدست ''مؤرخ اہل حدیث'' کی شیلڈ پیش کی گئی جمعیت سے وابستہ معروف لوگ موجود تھے۔

☆ ۱۶ اگست ۲۰۰۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان نے روڈ لاہور میں موصوف کی خدمات کے اعتراف میں شیلڈ عطا کی۔

☆ ۱۱ جنوری ۲۰۰۹ء کو لاہور ہمدرد ہال میں ادارہ الدعوۃ السلفیہ اور الاعتصام کے مدیر حافظ احمد شاکر اور ان کے صاحبزادگان نے شیلڈ سے نوازا۔

☆ ۱۱ اپریل ۲۰۰۹ء کو مولانا بھٹی کے دوست حافظ محمد اسلم اور قاری عبداللہ نے جامعہ محمدیہ ضلع رحیم یار خان میں ایک جلسے میں جامعہ کی جانب سے مولانا بھٹی کی ۷۰ ہزار روپیہ کی کتاب تقسیم کی گئیں اور بعد از خطاب شیلڈ دیا گیا۔

☆ ۳ مئی ۲۰۱۵ء کو جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے اساتذہ نے ایک تقریب کا اہتمام کر کے موصوف کی خدمات کے اعتراف میں شیلڈ سے نوازا۔

☆ جولائی ۲۰۱۵ء میں پیغام ٹی وی پاکستان کی جانب سے شیلڈ پیش کی گئی۔

☆ ۱۵ ستمبر ۲۰۱۵ء آزاد کشمیر کے موضع آٹھ مقام میں آپ کو شیلڈ دیا گیا۔

**مقالے وکتابیں:** موصوف کی علمی خدمات پر زندگی میں دو مقالے ڈگری کے لیے لکھے گئے۔ ایک فیصل آباد کالج کی پروفیسر فوزیہ سحر ملک نے پنجاب یونیورسٹی سے آپ کی نثر نگاری پر لکھا ہے جو شائع شدہ ہے۔

دوسرا مقالہ بھی پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ابوانس عبداللہ نے فقہائے ہند کے تناظر میں لکھا ہے۔

اس کے علاوہ مولانا محمد رمضان یوسف سلفی نے ''مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی حیات وخدمات کے نام سے مختلف اہل علم کے مقالوں کا ۲۴۰ صفحات پر مشتمل مجموعہ مکتبہ رحمانیہ سیالکوٹ سے شائع کیا۔

**وفات:** ۲۲ دسمبر ۲۰۱۵ء کو ۹۰ برس کی لمبی عمر پا کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

اللہ تعالی مغفرت فرما کر اعلی علیین میں جگہ دے۔ آمین

☆☆☆

# مؤرخ اسلام، محقق و دانشور، علامہ محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ سے ایک ملاقات

مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کا ایک اہم انٹرویو جو انھوں نے ۲۰۱۵ء میں رسالہ ''پیام آگہی'' کو دیا تھا اسے افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

**سوال: تاریخ پیدائش اور خاندانی پس منظر سے آگاہ فرمائیں؟**

**جواب:** میری تاریخ پیدائش ۱۵/ مارچ ۱۹۲۵ء ہے۔ خاندانی تعلق کوٹ کپورہ (سابق) ریاست فرید کوٹ مشرقی پنجاب سے ہے، لیکن میرے ننھیال (سابق) ریاست پٹیالہ کے ایک قصبے ہنڈیا میں سکونت پذیر تھے۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد تھا اور اس زمانے میں پہلے بچے کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل ننھیال والے بیٹی کو اپنے ہاں لے جاتے تھے۔ میری والدہ کو بھی ان کے والد (ہمارے نانا حکیم محمد رمضان) وہاں لے گئے تھے، اس لیے میری پیدائش ننھیال میں ہوئی اور پرورش کی منزلیں اپنے ددھیال (کوٹ کپورہ) میں طے کیں۔

خاندانی پس منظر خالص مذہبی تھا۔ میری پیدائش سے بھی پہلے ہمارے بزرگوں کی کوشش سے کوٹ کپورہ میں ''انجمن اصلاح المسلمین'' قائم کی گئی تھی، جس کا ہر سال سالانہ تبلیغی جلسہ بالعموم مارچ کے مہینے میں منعقد کیا جاتا تھا، جو تین دن تک جاری رہتا تھا۔ جلسے میں بہت سے علمائے کرام کو دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ تشریف لاتے اور تقریریں کرتے تھے، ان میں سے جن حضرات کو میں نے دیکھا، وہ تھے: مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، حافظ محمد گوندلوی، سید محمد شریف گھڑیالوی، مولانا محمد علی لکھوی، حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا عبدالمجید سوہدروی، مولانا احمد الدین گکھڑوی، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا عبداللہ ثانی امرتسری، حافظ محمد حسین روپڑی اور دیگر بہت سے حضرات۔ ان علمائے کرام کی تقریریں کوٹ کپورہ اور اس کے اردگرد کے دیہات وقصبات کے مسلمان تو سنتے ہی تھے، وہاں کے ہندو اور سکھ بھی بڑے غور سے ان کے وعظ سنتے اور پھر نہایت احترام سے ان کے ساتھ ملاقات کرتے۔ کوٹ کپورہ کے مسلمان مسلکاً اہل حدیث تھے اور وہاں بائیس مسجدیں تھیں، جو اہل حدیث کی تھیں۔ وہاں کا ماحول چونکہ مذہبی تھا اور میری پرورش اسی ماحول میں ہوئی تھی اس لیے مجھ پر ہمیشہ مذہب کا غلبہ رہا جسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔

**سوال: تعلیمی مراحل کے بارے میں کچھ بتائیں؟**

**جواب:** میں ۱۹۳۳ء میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس سے قبل اپنے دادا مرحوم سے قرآن مجید اور اردو کی بعض کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کی دعوت پر وہاں خطیب اور مدرس کی حیثیت سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی تشریف لے گئے تھے۔ دادا مرحوم نے مجھے دینیات کی تعلیم کے لیے مولانا ممدوح کی خدمت میں پیش کیا اور میں ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل ہو گیا۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ پہلے تفسیر و حدیث اور دیگر درسی کتابیں مولانا بھوجیانی سے پڑھیں، پھر مولانا ممدوح کے حکم کی تعمیل میں گوجرانوالہ گیا اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک کا درس دوبارہ حافظ محمد گوندلوی سے لیا۔ تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، ابوداؤد کی بعض کتابیں دوبارہ مولانا محمد اسماعیل سلفی سے پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ ان تینوں اساتذہ عظام کے طریق تدریس سے اپنی سمجھ کے مطابق فیض یاب ہوا، لیکن افسوس ہے میں خدمت تدریس کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ درسی کتابیں آج سے تقریباً پون صدی پہلے پڑھی تھیں اور بڑی محنت سے یہ مشکل مرحلہ طے کیا تھا۔ ستر سال کی طویل مدت گزرنے کے بعد میرے ذہن میں آتا ہے کہ اگر کسی موضوع کی کوئی کتاب اچھی طرح مطالعہ کر کے پڑھانے کا موقع ملے تو ان شاء اللہ یہ منزل طے کرنے کے لیے اللہ کامیابی عطا فرمائے گا۔

تعلیم کے معاملے سے مطلع ہونے کے بعد آیئے تحریر و نگارش کی طرف میرے قلم کی تربیت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور زیادہ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی نگرانی میں ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے طور پر کچھ بھی نہیں، مجھ پر میرے اللہ کا خاص کرم ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ان اصحاب فضل سے فیض یاب ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔

**سوال: دینی تعلیم کی طرف رجحان کا سبب کیا بنا؟**

**جواب:** دینی تعلیم کی طرف رجحان دادا مرحوم کی وجہ سے ہوا۔ ان کا اسم گرامی حکیم محمد تھا، وہ بہت نیک بزرگ تھے، فجر کی نماز کے لیے مجھے مسجد میں لے جاتے تھے۔ نماز کے بعد باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے، مجھے بھی تلاوت کا حکم دیتے اور میں تلاوت کرتا۔ انہوں نے بہت سے بچوں کو قرآن مجید پڑھایا اور مولوی رحیم بخش فیروزپوری مرحوم جو لاہور کی چینیاں والی مسجد کے امام و خطیب تھے، کی تصنیف کردہ ''اسلام کی کتاب'' پڑھائی، جس کا نام ''اسلام کی کتاب پہلی جلد'' سے ''اسلام کی کتاب چودھویں جلد'' تک ہے۔ دادا مرحوم اس کتاب کی پانچویں جلد

تک پڑھایا کرتے تھے۔

**سوال:** آپ کی تعلیم وتربیت میں مرکزی کردار کس کا ہے؟

**جواب:** میری تعلیم وتربیت میں اولین کردار میرے دادا حکیم محمد مرحوم کا ہے۔ اس کے بعد تعلیم وتربیت کی مختلف منزلیں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی نگرانی میں طے ہوئیں، جس کا سلسلہ رسمی تعلیم کے بعد بھی جاری رہا اور میں نے حتی الامکان ان کے ارشادات پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ ماضی کے اس تربیتی دور کو میں اپنے لیے بہترین دور قرار دیتا ہوں، جس کی بنیاد پر مستقبل کی چھوٹی سی عمارت تعمیر ہوئی اور مجھے اپنی محدود معلومات کے مطابق کچھ قلمی خدمت سرانجام دینے کے مواقع میسر آئے۔ اللہ کا مجھ عاجز پر یہ خاص کرم ہے۔

**سوال:** حصول علم کے بعد کیا مصروفیت اختیار کی؟

**جواب:** حصول کے فوراً بعد مجھے ہیڈ سلیمان کے محکمہ انہار میں بطور کلرک ملازمت مل گئی تھی۔ یہ ملازمت میں نے تقریباً ایک سال ہی کی۔ اس کے بعد میری آوارہ گردی کا سلسلہ شروع ہوگیا اور میں دہلی، متھرا، آگرہ، دھول پور، علی گڑھ، کان پور، میرٹھ وغیرہ معلوم نہیں کن کن شہروں اور علاقوں میں ایک عرصے تک گھومتا رہا۔ اس اثناء میں مجھے سا موگڑھ جانے کا موقع بھی ملا، جہاں ۱۶۵۸ء میں مغل حکمراں شاہ جہاں کی زندگی میں اس کے دو بیٹوں داراشکوہ اور اورنگ زیب عالم گیر کے درمیان تخت نشینی کی جنگ ہوئی تھی۔ داراشکوہ شکست کا کر بھاگ گیا تھا اور اورنگ زیب ہندوستان کا بادشاہ بن گیا تھا۔ جب آوارہ گردی سے میرا جی بھر گیا تو میں واپس اپنے گھر کوٹ کپورہ آگیا۔ اس وقت استاذِ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی فیروزپور کی جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں خطابت وتدریس کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ تیسرے دن میں ان کو سلام عرض کرنے کے لیے فیروز پور گیا تو فرمایا: اچھا ہوا تم آگئے۔ کل مولانا معین الدین تشریف لائے تھے اور تمہارے متعلق پوچھ رہے تھے کہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ انہیں مرکز الاسلام میں مدرس کی ضرورت ہے، تم وہاں جاؤ اور کام شروع کردو، بہت گھوم پھر لیا ہے، اب وہاں کے نصاب کے مطابق مصروفِ عمل ہوجاؤ۔ یہ مارچ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔

مرکز الاسلام موضع لکھوکے سے دو میل کے فاصلے پر آبادی سے دور ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ مولانا محمد علی لکھوی نے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا تھا۔ وہ تو مستقل طور پر مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہاں مسجد نبوی میں قرآن وحدیث کی تدریس میں مشغول ہوگئے تھے۔ ان کے بعد لکھوکے کا مدرسہ اور مرکز الاسلام کا ادارہ جسے جامعہ محمدیہ کے نام سے موسوم کیا گیا، مولانا محمد علی لکھوی کے صاحبزادوں مولانا محی الدین اور معین الدین کے زیر اہتمام رہا۔

بہر حال میں مرکز الاسلام چلا گیا اور کچھ عرصے کے بعد چودھری غلام حسین تہاڑیا بھی وہیں آگئے، نہوں نے فیروز پور کے آر، ایس، ڈی (ڑام سکھ داس) کالج میں بے اے پاس کیا تھا۔ ہم دو مدرس تھے اور قدیم وجدید نصاب کے مطابق خدمت انجام دیتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء تک ہم نے وہاں تدریس کی، پھر پاکستان آگئے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ مرکز الاسلام میں آج سے ستر سال پہلے جدید اور قدیم طرز کی تعلیم شروع کردی گئی تھی، جس کی طرف اصحاب مدارس کا اب دھیان ہوا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ خاندانی طور پر ہم لوگ لکھویوں کے مرید ہیں۔ میرے پردادا حکیم دوست محمد کے بھائی میاں امام الدین مرحوم ہمارے خاندان کے پہلے بزرگ تھے جنھوں نے مولانا محمد علی لکھوی کے والد محترم مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی (متوفی مئی ۱۸۹۵ء) کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ میں نے حال ہی میں مولانا محی الدین لکھوی (متوفی فروری ۱۹۹۸ء) کے حالات میں مستقل کتاب لکھی ہے، جو چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں تین سو سال کے طویل عرصے میں پھیلی ہوئی لکھوی خاندان کی تصنیفی وتدریسی اور روحانی خدمات کی پوری تفصیل معرضِ بیان میں آگئی ہے۔

**سوال:** بچپن کی کچھ حسین یادیں شیئر کریں گے؟

**جواب:** میری ولادت ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ اس حساب سے اب ۹۰/برس کی سرحد عبور کر رہا ہوں۔ اگر بچپن کا زمانہ پندرہ سولہ تک سمجھا جائے تو ۴۱۔۱۹۴۰ء تک چلتا ہے۔ اس اثنا میں بے شمار واقعات رونما ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا واقعہ ظہور میں آیا۔ اس وقت یہ واقعات حسین بھی ہوں گے اور خوش کن بھی، لیکن اب ان میں حسن کی رمق باقی نہیں رہی۔ ویسے بھی اصلی حسن کی عمر کم ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات چند لمحوں میں اس کا دم اکھڑ جاتا ہے، نہ اکھڑے تو مرجھا ضرور جاتا ہے اور گھبرا بھی جاتا ہے۔ بہر حال آپ نے پوچھ ہی لیا تو ۸۰۔۸۵/برس قبل کی چند یادیں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے نزدیک تو وہ اتنی پرانی اور بوڑھی کھوسٹ ہونے کے باوجود حسین ہیں، لیکن آپ کا معیارِ حسن شناسی کیا ہے اور انہیں کوئی حسین مانتا ہے یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں، آیئے چند یادیں سماعت فرمایئے۔

☆...ہم نے بھینس پال رکھی تھی، میں اسکول یا مسجد سے پڑھ کر آتا تو میری دادی جنہیں ہم ''انبو'' کہا کرتے تھے، میری ماں کو آواز دیتی: ''فاطمہ! منڈا پڑھ کے آیا ہے دودھ میں گھی اور کھانڈ بھی ڈال دو۔'' یہ وقت میرے لیے نہایت حسین اور خوش کن ہوتا تھا۔ اپنی دادی انبو کی یہ آواز میرے کانوں میں اب بھی پڑ رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میری ماں میرے لیے کانسی کے خوبصورت چھنے میں دودھ لا رہی

ہے، پھر چند ثانیوں کے بعد میں دودھ پی رہا ہوں، دودھ پینے کے بعد کی خوشی سے اپنی ماں اور داوی سے لپٹ جاتا ہوں۔

☆.....ہماری انبو ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی نابینا ہوگئی تھی۔ سردیوں کی راتوں میں وہ ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے ساتھ لحاف میں سلاتی اور ہمیں کسی بادشاہ، پری، وزیر، عالم یا فقیر کی کہانی سناتی اور ہم بڑے غور سے کہانی سنتے۔ کہانی ختم ہو جاتی تو ہم کہتے انبو پھر کیا ہوا؟ کہانیوں کا یہ سلسلہ ہمارے نزدیک بڑا حسین ہوتا تھا۔

☆.....وہ نہایت سستا زمانہ تھا، پیسا، دمڑی، دھیلہ سب سکہ چلتا تھا، اسکول جاتے وقت گھر سے بالعموم بچے کو ایک پیسا یا دو پیسے ملتے تھے۔ مجھے میرے والد جنہیں ہم میاں جی کہا کرتے تھے، ایک پیسا دیتے تھے اور میں اس پر بہت خوش ہوتا تھا، عبدالغنی دکان دار کو میں پیسا دیتا، ایک دفعہ آدھے پیسے کی روڑیاں لیتا اور دوسری دفعہ باقی آدھے پیسے کی اور کوئی چیز۔

☆.....ہمارے خاندان کے زیادہ لوگوں کا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا، ایک مرتبہ پاسنگ کیے لیے اکٹھی چار، پانچ بسیں لاہور آئیں تو ہم چھ سات ہم عمر بھی بسوں پر لاہور آ گئے۔ یہاں ہم نے عجائب گھر، چڑیا گھر، شالامار باغ، مقبرہ جہانگیر، انارکلی وغیرہ مقامات کی خوب سیر کی۔ میرے والد نے مجھے ترکی ٹوپی لے کر دی۔ اس زمانے میں ترکی ٹوپیوں کا رواج تھا۔ لاہور آنا ان دنوں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ واپس جا کر ہم کئی دن لوگوں کو لاہور کی باتیں سناتے رہے۔ لوگ بڑی حیرانی سے باتیں سنتے اور تعجب کرتے کہ لاہور کیسا خوبصورت شہر ہے؟

☆.....چھوٹی عمر میں میں نے سائیکل چلانا سیکھا اس وقت سائیکل کسی کسی کے پاس ہوتی تھی۔ میں اپنے قد کے مطابق چھوٹے سائز کی سائیکل اپنے شہر کی گلیوں میں چلاتا تو انتہائی خوش ہوتا اور اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی سمجھتا۔ یہ میرے لیے بڑا حسین سماں ہوتا تھا۔

☆.....سبق سن کر استاذ شاباشی دیتے اور کبھی ایک دو پیسے بھی عنایت کر دیتے تو بڑی مسرت ہوتی اور یوں لگتا جیسے بہت بڑا خزانہ ہاتھ میں آ گیا ہو۔

☆.....فروری ۱۹۳۹ء میں فیروز پور میں تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ آج لاہور موچی دروازے میں مولانا ابوالکلام آزاد تقریر کریں گے۔ میں ان کی تقریر سننے کے لیے لاہور آیا، مولانا نے تقریر تو نہ کی، لیکن ان کی زیارت کا موقع مل گیا، جسے میں نے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا۔ دوسرے دن اخبار میں پڑھا کہ آج مولانا تقریر کریں گے، میں پھر لاہور آیا اور ان کی تقریر سنی جو ۳۵ منٹ جاری رہی تھی۔ تقریر سن کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر تھی۔ اتنے عظیم آدمی کو دیکھنا اور اس کی تقریر سننا اس چھوٹی عمر میں میرے لیے نہایت مسرت کی بات تھی۔

☆.....۱۹۳۷ء میں مرکز الاسلام میں میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقۂ درس میں شامل تھا۔ وہاں مجھے کسی ذریعے سے مولانا عبدالحلیم شرر کے چند ناول مل گئے۔ وہ تھے: حسن انجیلنا، ملک العزیز ورجنا، فلورا فلورنڈا، حسن بن صباح وغیرہ۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں وہ ناول میں نے پڑھے۔ شرر کی زبان اور انداز، تحریر سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ذہن میں آیا، کاش مجھے بھی لکھنے کا طریقہ آ جائے اور میں اپنی بات بہتر طریقے سے قلم کی زبان سے بیان کر سکوں۔

☆.....انہیں دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کا دہ بیان جو انھوں نے علی پور جیل (کلکتہ) میں دیا تھا اور قول فیصل کے نام سے کتابی صورت میں چھپا تھا۔ بیان کیا تھا، ادب و انشاء اور معلومات کا شاہکار تھا۔ اب تک اس قسم کا زوردار اور حق و صداقت پر مبنی بیان کسی نے عدالت میں نہیں دیا ہوگا۔ چھوٹی عمر میں اس بیان کے جو اثرات ذہن پر مرتسم ہوئے وہ ہمیشہ قائم رہے۔

☆.....ایک اور ''حسین'' یاد اس کا تعلق بھی تیرہ چودہ سال کی عمر سے ہے۔ میں فیروز پور کے دہلی دروازے میں ایک بک اسٹال پر اخبارات و رسائل دیکھ رہا تھا کہ ایک ماہانہ رسالے پر نظر پڑی جس کا نام تھا ''بیسویں صدی'' اس کا ایڈیٹر ہندو تھا۔ اس کا نام تو غالباً رگھوناتھ تھا، لیکن وہ ''خوشتر گرامی'' کہلاتا تھا اور یہی نام بطور ایڈیٹر اس رسالے پر لکھا تھا۔ خوشتر گرامی اپنے دور کا اردو کا مشہور ادیب تھا۔ اس رسالے کا دفتر لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے باہر تھا۔ وہ رسالہ میں نے چار آنے میں خریدا جو تقریباً ایک سو صفحات میں پھیلا ہوا تھا اور افسانہ نمبر تھا۔ بہت سے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ۔ اس میں ایک افسانہ اسحاق رام نگری کا تھا۔ یہ نام پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، ایسے لگا جیسے میں ہی اسحاق رام نگری ہوں اور میں نے یہ افسانہ لکھا ہے۔ سب سے پہلے یہی افسانہ پڑھا، پڑھتا جاتا تھا اور خوش ہوتا جاتا تھا۔ ''اپنا لکھا ہوا'' یہ افسانہ میں نے کئی دفعہ پڑھا، ہر دفعہ کی ''قرأت'' میں مسرت کی نئی لہر اٹھتی تھی اور ذہن میں آتا تھا کہ میں نے کتنا اچھا افسانہ لکھا ہے۔ حالانکہ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ افسانہ کیا ہوتا ہے، اس رسالے کے میں نے تمام افسانے پڑھے، اس سے اگلے مہینے کا رسالہ بھی لیا۔ اس میں اسحاق رام نگری کا افسانہ یعنی ''میرا افسانہ'' نہیں تھا۔ میری عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی اور میں فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقہ درس میں شامل تھا۔ ''بیسویں صدی'' کے ان دو شماروں کے بعد میں نے اس کا کوئی شمارہ نہیں لیا اور نہ کسی رسالے کا کوئی افسانہ پڑھا۔ پڑھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔

**سوال:** تحریک آزادی کا کچھ آنکھوں دیکھا حال بیان کیجیے؟

**جواب:** انگریزوں کے برصغیر پر قبضے کے بعد اس خطہ ارض کو آزاد کرانے کے

لیے بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ خالص مسلمانوں کی تحریک آزادی کے لیے سلسلے میں مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید دہلوی کی کوشش سے ایک بے نام جماعت حال میں وجود میں آئی، جسے بعد میں ''جماعت مجاہدین'' کہا جانے لگا۔ اس کا آغاز ۱۸۲۶ء میں ہوا تھا۔ اس جماعت نے موجودہ صوبہ خیبر پختونخواہ کے پار کے علاقے کو مرکز بنا کر انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جہاد شروع کیا۔ اس کا سلسلہ ۱۸۲۶ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک ایک سو اکیس سال جاری رہا۔

پھر مئی ۱۸۵۷ء میں پورے برصغیر میں انگریز حکومت کے خلاف اس تحریک آزادی نے جنم لیا، جس میں مسلمان اور ہندو اور ریاستوں کے بعض نواب اور راجے بھی شریک تھے اور باقاعدہ اسلحہ کے ساتھ انگریزوں سے برسرپیکار تھے، لیکن اس کا نتیجہ انگریزوں کے حق میں نکلا اور کامیابی کے بعد انہوں نے اسے ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے موسوم کیا پھر بے شمار لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں اور ان کے مال ومنال پر قبضہ کرلیا گیا۔

اس کے چند سال بعد وہابی تحریک اٹھی اور انگریزی حکومت نے وہابیوں کے خلاف بغاوت کے پانچ مقدمے قائم کیے۔ کتنے ہی وہابی علمائے کرام اور ملک کی اہم شخصیتوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر کالے پانی بھیج دیا گیا۔ ان میں سے بعض علماء وہیں وفات پاگئے اور بعض کو بیس سال یا اس سے زیادہ عرصے کے بعد رہائی نصیب ہوئی اور وہ وطن واپس آئے۔

وہابی تحریک ہی میں میاں سید نذیر حسین دہلوی کو گرفتار کیا گیا اور انہیں دہلی سے تقریباً ایک ہزار میل دور راولپنڈی لاکر قید کردیا گیا، وہ ایک سال قید رہے۔

آزادی کی کئی تحریکیں یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹھیں۔ یہ جنگ جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع اور اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کے اختتام کے بعد تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، عدم تعاون وغیرہ نے زور باندھا اور انگریزوں نے ان تحریکوں میں حصہ لینے والے بے شمار لوگوں کو گرفتار کر کے ملک کی مختلف جیلوں میں بند کردیا۔ ان تحریکوں سے متعلق پوری تفصیلات اس موضوع کی کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتابیں انگریزی میں بھی ہیں اور اردو میں بھی۔ انگریز مصنفین نے بھی لکھی ہیں اور برصغیر کے اہل قلم نے اردو میں بھی تحریک آزادی کے ابتدائی دور کی طرف اختصار کے ساتھ چند اشارے ضروری تھے۔ اب آتے ہیں آپ کے اس ارشاد کی طرف کہ ''تحریک آزادی کا کچھ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جائے''۔

یہاں بھی اشاروں ہی سے کام لیا جائے گا حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی تحریک تو ہمیشہ کسی نہ کسی انداز سے جاری رہی ہے۔ موقع کی مناسبت سے کبھی اس میں تیزی آجاتی تھی اور کبھی معاملہ کسی قدر نرم پڑ جاتا تھا۔ یورپ کی دوسری جنگ عظیم ستمبر ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی اور جون ۱۹۴۵ء تک چھے سال جاری رہی تھی۔ اس جنگ کے دوران انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریکیں جاری ہوئیں اور جس زور اور جذبے سے آزادی کا مطالبہ کیا گیا وہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مطالبہ کامیاب رہا اور ہم نے ان تحریکوں کو اور ان کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خوب دیکھا، بلکہ اس میں بھرپور حصہ بھی لیا اور قید بھی ہوئے۔ خالص مسلمان سیاسی جماعتوں میں مجلس احرار اور جمعیت علمائے ہند کے مقرروں کی تقریریں سنیں اور ان کو گرفتار ہوتے دیکھا۔ احرار مقرر جب تقریر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زبانوں سے انگریزی حکومت کے خلاف آگ کے شرارے نکل رہے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شورش کاشمیری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبدالغفار غزنوی بہت بڑے مقرر تھے۔

جنگ کے زمانے ہی میں ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرصدارت بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں انگریز حکومت کے خلاف ''ہندوستان خالی کرو'' (Quit-India) ریزولیوشن پاس کیا گیا، جس کے نتیجے میں اسی وقت پورے ہندوستان میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مولانا داؤد غزنوی اس وقت کانگریس میں شامل تھے۔ انہیں لاہور چنیاں والی مسجد سے گرفتار کیا گیا اور وہ تین سال سنٹرل جیل لاہور میں قید رہے۔ اس سے قبل وہ کئی دفعہ قید ہوئے اور کئی سال ملک کی مختلف جیلوں میں رہے، لیکن یہ قید جو ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو ''ہندوستان خالی کرو'' کے نتیجے میں ہوئی، ان کی سیاسی زندگی کی آخری قید تھی۔

جنگ کے زمانے ہی میں پنجاب کی ریاستوں میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی، اس تحریک کا نام ''پرجا منڈل'' تھا۔ پرجا کے معنی عوام اور منڈل کے معنی جماعت یعنی عوام کی جماعت۔ پنجاب کی ریاستوں میں ریاست فرید کوٹ بھی شامل تھی اور میں بھی ریاست کے ایک شہر کوٹ کپورہ کا رہنے والا تھا۔ اس ریاست میں بھی آزادی کی تحریک نے زور باندھا اور بہت سے لوگوں میں سے تیرہ آدمیوں کو گرفتار کرلیا گیا، جن میں میں بھی شامل تھا۔ ہم تیرہ آدمی ریاستی حکومت کے نزدیک زیادہ خطرناک تھے، ہمیں جیل کی جن کوٹھریوں میں قید کیا گیا تھا انھیں جیل کی اصطلاح میں ''سنگین کوٹھریاں'' کہا جاتا ہے۔

ان جماعتوں کی تحریکوں کے علاوہ جو بہت بڑی اور بے مثال تحریک ۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی، وہ مسلم لیگ کی ''مطالبہ پاکستان'' کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے بہت جلد کامیابی حاصل کرلی اور مسلمانوں کا مطالبہ حصول پاکستان کامیابی سے ہمکنار ہوا

اور برصغیر میں پاکستان کے نام سے ایک مستقل ملک معرضِ قیام میں آ گیا۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن یہ وعدہ پورا نہ ہوا اور پاکستان میں خالص اسلامی نظام قائم نہ ہو سکا۔ یہ وعدہ کبھی پورا ہوگا بھی یا نہیں، اس کا اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا۔ بہرحال ہم نے یہ تحریک اپنی آنکھوں سے دیکھی اور اس کے زوروار نعرے کانوں سے سنے۔

یہاں ایک گزارش یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی حکومت کی جو پہلی کابینہ بنائی گئی، اس کا وزیر قانون ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل اور وزیر خارجہ غیر مسلم (مرزائی) چودھری ظفر اللہ خان کو بنایا گیا تھا۔

**سوال:** ہندوستان کی کن کن معروف علمی اور سیاسی شخصیات سے ملاقات ہوئی؟

**جواب:** ہندوستان کی بے شمار شخصیات کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان سے گفتگو کے مواقع میسر آئے، ان میں سیاسی رہنما بھی شامل ہیں اور غیر سیاسی بھی، بعض حضرات وہ ہیں جو بیک وقت سیاسی رہنما بھی اور علم و فضل میں بھی یکتائے روزگار ہیں۔ مثلاً ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبدالوہاب آردی، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری، مولانا ابوالکلام آزاد کے سیکرٹری محمد اجمل خان، پروفیسر ہمایوں کبیر، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور دیگر لاتعداد حضرات رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

سیاسی رہنماؤں میں مولوی فضل الحق بنگالوی، شیخ عبداللہ جنہیں کسی زمانے میں شیر کشمیر کہا جاتا تھا، خان عبدالغفار خان، عبدالولی خان، عبدالصمد خام اچکزئی، نواب زادہ لیاقت علی خان، پنڈت جواہر لال نہرو، سروار ولبھ بھائی پٹیل، شیخ حسام الدین و دیگر بہت سارے لوگ۔

**سوال:** تقسیم وطن کے وقت قتل وغارت کے کیا اسباب تھے؟

**جواب:** تقسیم ملک کے وقت فسادات کا جو ریلا آیا اور برصغیر کے گلی کوچوں میں جو خونی پہیہ چلا اس کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ملک کی تقسیم کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا، تقسیم سے پہلے ہی حالات خراب ہو گئے تھے اور مختلف مقامات میں فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ سکھ بھی بپھر گئے تھے، بلکہ مسلمانوں کا زیادہ تر قتل و غارت سکھوں کے ہاتھوں ہوا۔ پھر انگریزوں نے جس انداز سے ملک تقسیم کیا وہ انتہائی غلط تھا۔ مسلمان رہنماؤں نے اس سلسلے میں زیادہ غور نہیں کیا۔ اس طرح کے کئی اسباب ہیں جن کی وجہ سے فسادات کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ لاکھوں مسلمان اس زد میں آ گئے اور مارے گئے۔

**سوال:** آپ کی تصنیفی وادبی خدمات بہت زیادہ ہیں کچھ اس بارے میں بتایئے اب تک کتنی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں؟

**جواب:** میری تصانیف چالیس کے قریب ہیں، ان میں اکیلی فقہائے ہند دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر کتاب کئی کئی سو صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ پندرہ سال ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر رہا، اس میں جو مضامین، اداریے، ادارتی شذرات لکھے یا کتابوں پر تبصرے کیے ان کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ میں نے ''منہاج'' کے نام سے ایک سہ روزہ اخبار جاری کیا تھا، جس نے چودہ مہینے کی عمر پائی۔ اس میں شائع شدہ اداریوں اور ادارتی شذرات کی تعداد کا بھی علم نہیں۔ اس میں کتابوں پر تبصرے کیے، لیکن یاد نہیں کس کس پر۔ یکم جولائی ۱۹۶۵ء کو ہفت روزہ اخبار ''توحید'' جاری ہوا۔ میں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا اور سید ابوبکر غزنوی نگراں اور مولوی عمر فاروق غزنوی طابع ناشر تھے۔ اس اخبار میں میرے کتنے مضامین چھپے اور وہ کن موضوعات پر تھے اس سے بھی بے خبر ہوں۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا، اس وقت ادارے کی طرف سے ماہنامہ ''ثقافت'' شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ دسمبر ۱۹۶۷ء تک جاری رہا، میں اس میں مضمون لکھتا رہا، لیکن تعداد معلوم نہیں۔ پھر ''ثقافت'' کی بجائے جنوری ۱۹۶۸ء سے ادارے کا رسالہ ماہنامہ ''المعارف'' شائع ہونے لگا۔ اس کے اجرا سے کچھ عرصہ بعد مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا، اس میں اداریہ بھی لکھتا تھا۔ مضامین بھی لکھتا تھا اور کتابوں پر تبصرے بھی کرتا تھا۔ بائیس سال میں اس ماہنامے کا ایڈیٹر رہا لیکن اس میں جو کچھ میں نے لکھا اس کی تعداد کا پتا نہیں۔ اسی اثنا میں تقریباً ایک سال مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ ''اہل حدیث'' کی ادارت کی۔ اس میں شائع شدہ مضامین کی تعداد کا بھی میرے پاس کوئی ریکارڈ نہیں۔ کسی زمانے میں روزنامہ ''امروز'' بہت بڑا اور مشہور اخبار تھا۔ اس میں کئی سال میں اتوار اور جمعہ کو مضامین لکھتا رہا۔ بعض دفعہ ان دو دنوں کے علاوہ بھی لکھتا تھا۔ اس کے مضامین کی تعداد سے بھی میں بے خبر ہوں۔ کچھ عرصہ روزنامہ پاکستان میں مضامین لکھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی میرے ۳۲۔۳۳/ مقالے چھپے، قرآن مجید پر بھی، شخصیات پر بھی اور بعض دیگر موضوعات پر بھی، ان مقالوں کے صفحات کی تعداد کا تعین کرنا بھی مشکل ہے۔ ایک طویل مدت تک ریڈیو پاکستان میں تقریریں کیں، لیکن پتہ نہیں کس کس موضوع پر کتنی تقریریں کیں۔ ان تقریروں کے مسودے میرے پاس نہیں ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی تقریریں کی اور وہ بھی سرکاری ٹیلی ویژن۔ گزارش کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی کتابوں کی تعداد کا تو علم ہے، لیکن رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین و مقالات

کا علم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ میری کل شائع شدہ تحریرات عام سائز کے پچاس پچپن ہزار صفحات پر محیط ہوں گی۔

**سوال:** مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ساتھ وابستگی کب اور کیسے ہوئی؟

**جواب:** ۲۴ر جولائی ۱۹۴۸ء کو مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی صدارت میں مغربی پاکستان کے تقریباً ڈھائی سو علماء وزعماء کی موجودگی میں مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان قائم ہوئی۔ اس وقت مشرقی پاکستان میں مولانا عبداللہ کافی کی صدارت میں جماعت کی تنظیم قائم ہو چکی تھی، اس کا نام جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان تھا۔

ضلع لائل پور سے ۲۴ر جولائی کی میٹنگ میں جن لوگوں کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی، ان میں میرے علاوہ مولانا عبیداللہ احرار، صوفی محمد عبداللہ، میاں محمد باقر، مولانا اللہ بخش کمیر پوری شامل تھے۔ یعنی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے پانچ آدمی مرکزی جمعیت کے قیام کے وقت موجود تھے۔ پھر اس کے تین مہینے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اس کا آفس سیکریٹری بنا دیا گیا۔ اس طرح میں مرکزی جمعیت کے قیام کے ابتدائی دور سے اس سے وابستہ ہوں۔

**سوال:** آپ کے مطالعہ کا کیا معمول ہے؟

**جواب:** مختلف موضوعات کی کتابیں ہر وقت میری میز اور چارپائی پر رہتی ہیں اور میں کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں، بغیر مطالعہ کے وقت گزارنا مشکل ہے، مطالعہ کے علاوہ روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنا میرا معمول ہے۔ اخبار بھی روزانہ پڑھتا ہوں۔

**سوال:** دین کا طالب علم کس طرح کا میاب لکھاڑی بن سکتا ہے؟

**جواب:** اس کا تعلق اپنے ذوق اور محنت سے ہے، اگر دینی علوم کے طالب علم اپنی دلچسپی کی کتابوں کا مطالعہ کریں اور معلومات میں اضافے کے لیے کوشاں ہوں تو یہ مدرس کے علاوہ بہترین مصنف بھی بن سکتے ہیں، جتنا تحریری کام علمائے دین نے کیا ہے کسی نے نہیں کیا ہے۔ نواب صدیق حسن خان، علامہ شبلی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبیداللہ مبارکپوری وہ علمائے دین تھے جنہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں، اب بھی بہت سے علمائے کرام بڑی تحریری خدمات سر انجام دے رہے ہیں، طلباء کو تحریری کام میں آگے لانے کے لیے اساتذہ کو بھی کردار ادا کرنا چاہیے۔

**سوال:** مدارس کے کردار کے بارے میں کیا کہیں گے؟

**جواب:** مدارس اور دینی تعلیم کی وجہ سے ہی یہاں اسلام کا بول بالا ہے، جس قدر دینی تعلیم عام ہوگی اسی قدر اسلام کی اشاعت کا سلسلہ وسیع ہوگا۔ دینی مدارس میں حالات کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دی جائے تو اس کے فارغ التحصیل حضرات بہترین خدمات سرانجام دے سکتے ہیں اور معاشرے میں ان کا کردار قابل رشک ہوگا۔

**سوال:** کیا مدارس دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق علماء تیار کر رہے ہیں؟

**جواب:** اس کا تعلق مدارس کے اربابِ انتظام اور اساتذہ کرام سے ہے، انہیں غور کرنا چاہیے کہ وقت کی صدا کیا ہے اور حالت کا رخ کس طرف ہے؟ ان کا فرض ہے کہ مدارس کے اسلوب تدریس کو وقت کی ضرورت کے قالب میں ڈھالیں۔

**سوال:** عصری اور دینی علوم کے امتزاج کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

**جواب:** ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس دور کا تقاضا یہ ہے کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی اہتمام کیا جائے، اس سے علماء کا وقار بڑھے گا۔ مدارس کے احترام میں اضافہ ہوگا اور دینی علوم لوگوں کی عقیدت کا مرکز قرار پائیں گے۔

**سوال:** آج تک آپ نے کن کن ممالک کا سفر کیا؟

**جواب:** یہ سلسلہ بہت محدود ہے، ۲۰۰۰ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، بعد ازاں جون ۲۰۰۸ء میں عمرے کا شرف بھی حاصل ہوا اور کویت کا سفر بھی کیا جہاں بہت سے عرب علماء اور پاکستان اور ہندوستانی اصحاب فضیلت سے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔

**سوال:** کچھ ایسے واقعات جو آج تک آپ نے نہیں لکھے؟

**جواب:** میرا اصل موضوع برصغیر کی اسلامی تاریخ ہے اور اس میں بھی شخصیات کا عنصر غالب ہے۔ بعض شخصیات کے ایسے واقعات بھی ہیں جو میرے نزدیک قابل تحریر نہیں ہوتے، انہیں چھوڑ دیتا ہوں اور ان کی اچھائیاں ضبط تحریر میں لے آتا ہوں جو واقعات میں نہیں لکھتا وہ کسی سے زبانی بھی بیان نہیں کرتا اور نہ کبھی ان شاء اللہ کروں گا۔ میرا کام لوگوں کی اچھائیوں کو اجاگر کرنا ہے برائیوں کو نہیں۔

**سوال:** علم وادب اور سیاست میں کس کس سے متاثر ہیں اور کیوں؟

**جواب:** میں زیادہ متاثر اپنے اساتذہ کرام سے ہوں اور وہ پانچ شخصیات ہیں، جن کے اسمائے گرامی پہلے عرض کر چکا ہوں، اس فہرست میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری (مصنف رحمۃ للعالمین ﷺ) اور مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی شامل کر لیجیے۔ ان سب بزرگان عالی قدر کے نام ہیں: حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا محمد حنیف ندوی،

علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ابوالکلام آزاد۔

**سوال:** کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کچھ ایسے کام ہیں جو آپ ابھی تک نہیں کر سکے؟

**جواب:** جی ہاں! بعض ایسے کام ہیں جو میں کرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی تک نہیں کر پایا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی حروف تہجی کی ترتیب سے لسان القرآن کے نام سے قرآن کریم کا توضیحی لغت لکھنا شروع کیا تھا۔ انہوں نے حرف الف سے حرف دال تک دو جلدیں لکھی تھیں کہ وفات پا گئے، اس کے بعد دوستوں کے اصرار پر میں نے کام شروع کیا اور حرف دال سے حرف زا تک لکھا جو ایک جلد میں تھا۔ پھر حرف سین سے کام شروع کیا تھا لیکن مکمل نہ کر سکا۔ قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے میری حوصلہ افزائی فرمائی اور کام مکمل کرنے کے لیے بار بار کہا لیکن کام آگے نہ بڑھ سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کام کو حرف ی تک مکمل کیا جائے۔ دوسرا کام جو کرنے کا ارادہ ہے وہ ''برصغیر میں اہل حدیث کی سیاسی خدمات'' مرتب کرنے کا ہے کہ جس سیاسی جماعت میں بھی کسی صاحب نے حصہ لیا اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا جائے۔ یہ دو اہم کام ہیں جو میں نہیں کر سکا اور کرنا چاہتا ہوں اور بھی بعض کام ہیں۔

**سوال:** اوراد و وظائف کے حوالے سے آپ کا کیا معمول ہے؟

**جواب:** اوراد و وظائف کی اللہ تعالیٰ نے بہت لوگوں کو توفیق بخشی ہے اور وہ اپنے علم اور ہمت کے مطابق اس راہ صواب پر گامزن ہیں، اس سلسلے میں ایک عرض کرتا ہوں، ایک بزرگ میاں الحمدللہ تھے، ان کا اصل نام تو امام الدین تھا، لیکن وہ ہر بات پر الحمدللہ کہنے کے عادی تھے، اس لیے لوگوں نے ان کا نام میاں الحمدللہ رکھ دیا تھا، ضلع گورداسپور کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے اور مولانا سید محمد داود غزنوی کے والد مکرم مولانا سید عبدالجبار غزنوی کے مرید تھے۔ ان کی ہمارے ہاں کوٹ کپورہ میں آمد و رفت رہتی تھی، نہایت صالح اور متقی بزرگ۔ مجھے چھوٹی عمر میں اس قسم کے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے اور ان سے وظیفے پوچھنے کی عادت تھی۔ اب بھی اس عادت کے کچھ آثار باقی ہیں جو کبھی کبھی اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ ایک دن میں نے میاں الحمدللہ سے عرض کیا کہ کوئی ایسا وظیفہ بتائیے کہ میرا حافظہ مضبوط ہو جائے اور جو کچھ میں پڑھوں وہ یاد رہے۔ فرمایا: الحمدللہ۔ ہر نماز کے بعد ''رب زدنی علما''، ''لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم''، ''رب اشرح لی صدری ویسرلی امری احلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی'' پڑھا کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا! الحمدللہ۔ میرا خیال ہے یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ میں میاں الحمدللہ کا بتایا ہوا یہ وظیفہ پڑھتا رہوں۔

**سوال:** اخلاقی و معاشرتی اقدار کی تبدیلی کا سفر آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا، کیا اسباب و عوامل ہیں؟

**جواب:** ہم اسلامی اقدار اور دینی معاشرے سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں، اس کا اصل سبب میرے نزدیک وہ پروگرام اور اشتہارات ہیں جو ٹیلی ویژن پر دن رات چلتے ہیں، ہمارے بچے انہیں دیکھتے ہیں، ان پروگراموں کی وجہ سے لباس، زبان، گفتگو سب کچھ بدل گیا اور جو حالات پیدا ہو گئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مزید برآئیاں آئیں گی۔ اللہ ہی مہربانی کرنے والا ہے۔

**سوال:** نجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیں گے، شادی کب ہوئی، اولاد کے کیا مشاغل ہیں؟

**جواب:** میری دو بیٹیاں ہیں، بڑی بیٹی ماشاءاللہ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں والی ہے۔ چھوٹی بیٹی کا بڑا بیٹا اور ایک بیٹی سرکاری اداروں میں پڑھاتے ہیں، چھوٹے بیٹے بیٹیاں اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دو بیٹے تجوید کے ساتھ قرآن کے حافظ ہیں۔ یہ میری بیٹیوں کی اولاد ہے۔ میرا بیٹا کوئی نہیں، بیوی کی وفات پر آٹھ سال گزر چکے ہیں۔

**سوال:** زندگی کے طویل سفر میں یادگار لمحات کن کو سمجھتے ہیں؟

**جواب:** یادگار لمحات تو بہت ہیں، مثلاً جب میں نے قرآن مجید ختم کیا تو اور آمین کی گئی تو وہ یادگار لمحہ تھا، اسی طرح جب قرآن کا ترجمہ ختم ہوا تو وہ بھی ایک سہانا وقت تھا، پھر جب میرا پہلا مضمون ''اخبار الاعتصام'' میں شائع ہوا تو بے حد خوشی ہوئی تھی، جب اس اخبار کی پیشانی پر بطور ایڈیٹر میرا نام لکھا گیا تو یہ ایسا لمحہ تھا جس کا مجھے کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا، اس سے سولہ سترہ سال بعد جب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے میری پہلی کتاب یعنی دنیا کے اولین دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ''الفہرست'' کا اردو ترجمہ اور حواشی کی اشاعت عمل میں آئی تو خوشی سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ ترجمہ حواشی تقریباً ساڑھے نو سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

**سوال:** کون سی ایسی دعائیں ہیں جو من و عن قبول ہوئیں؟

**جواب:** اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ انسان جب بھی کوئی دعا کرے وہ قبول کرتا ہے، میری دعا بھی وہ قبول کرتا ہے، آپ کی بھی کرتا ہے، بس انسان کو اللہ سے دعا کرنے کے طریقے کا علم ہونا چاہیے۔ میرے جیسے لوگوں کے پاس اللہ کے سہارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ صرف دعا ہے جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا سلسلہ بے حد وسیع ہے، وہ دعا قبول فرماتا ہے۔

**سوال:** آپ کو غصہ عموماً کس بات پر آتا ہے؟

**جواب:** غصہ تو کسی نہ کسی بات پر ہر شخص کو آتا ہے، مجھے بھی آتا ہے جب

میرے لکھنے پڑھنے کے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

**سوال:** نثر تو آپ نے بہت لکھی، کبھی شاعری کا خیال آیا، کوئی پسندیدہ شعر؟

**جواب:** شاعری بہت مشکل ہے، یہ کام میرے کرنے کا نہیں ہے۔ کسی زمانے میں بہت سے شعراء کے عربی فارسی، اردو، پنجابی شعر یاد تھے، اب بھی بہت سے اشعار یاد ہیں آپ کو ان سے مطلع ہو کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

**سوال:** دینی جرائد کی اہمیت اور کردار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

**جواب:** دینی جرائد تبلیغ اسلام کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے لوگوں کی علمی اور ذہنی تربیت ہوتی ہے اور اللہ کے فضل سے ہو رہی ہے۔ میرے پاس بہت سے ہفت روزے اور ماہنامے آتے ہیں۔ میں ان کے اربابِ انتظام اور مدیر حضرات کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھ گوشہ گیر کو یاد رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں ان جرائد سے انہیں کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے، لیکن داد دینی چاہیے ان کے منتظمین کو کہ وہ صرف دینی اقدار کے فروغ اور اسلامی احکام کی تبلیغ اشاعت کے جذبے سے یہ گھاٹا برداشت کر رہے ہیں۔ ان رسائل و جرائد کی زبان اور انداز بھی لائق تحسین ہے۔ معاشرے کی اصلاح اور عوام میں دینی حمیت بیدار کرنے کے لیے یہ جرائد و رسائل جو کردار ادا کر رہے ہیں، اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان سے تعاون کرنا ہمارا فرض ہے۔

**سوال:** اب تک آپ کی خدمات کے اعتراف میں کن کن اعزازات سے نوازا گیا؟

**جواب:** یہ فہرست کچھ طویل ہے تاہم کچھ عرض کرتا ہوں:

۱.... ۱۲ر اگست ۲۰۰۵ء کو مجھے میاں طاہر نے اپنے قائم کردہ مرکز الحرمین الاسلامی (فیصل آباد) میں دعوت دی، وہاں میری ''تصنیفی خدمات'' کا تذکرہ کیا گیا اور مجھے شیلڈ دی گئی۔ یہ میرے بارے میں پہلی تقریب تھی۔

۲.... اس سے تیسرے دن ۱۴ر اگست ۲۰۰۵ء کو گجرات میں حافظ عبدالستار عاصم (لندن) حافظ طارق محمود یزدانی، قاضی عبدالقدیر خاموش اور بعض دیگر حضرات نے وہاں کے صوفی ریسٹورنٹ ہال میں تقریب کا اہتمام کیا اور اس فقیر کو شیلڈ عطا کیا۔ اس موقع پر بھی متعدد حضرات نے تقریریں کیں۔ تقریریں سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں جو تھوڑی بہت تحریری خدمات سرانجام دے رہا ہوں اس سے کچھ دوست آگاہ ہیں۔

۳.... تیسری تقریب کا اہتمام مرکز ابن الخطاب الہ آباد (ضلع قصور) میں میرے مرحوم دوست مولانا اکبر سلیم نے کیا۔ یہ ۲۷ر مئی ۲۰۰۶ء کی بات ہے۔ مرکزی ابن الخطاب ایک تدریسی ادارہ ہے، وہاں بہت بڑا مجمع تھا۔ تقریریں ہوئیں اور شیلڈ مولانا محمد یوسف راجووالوی مرحوم کے دست مبارک سے دی گئی۔

۴.... ۱۴ر اگست ۲۰۰۷ء کو مجھے ہندوستانی محقق و مصنف پروفیسر عبدالرحمٰن فریوائی (امام سعود یونیورسٹی ریاض) نے اپنے والد محترم عبدالجبار کے نام سے ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایوارڈ وہ بہت سالوں سے کسی نہ کسی مصنف کو (جسے مناسب سمجھیں) ہر سال ۱۴ر اگست کو دیتے ہیں۔ مہمان خصوصی انہوں نے فیصل آباد کے علی ارشد اور لاہور کے حافظ احمد شاکر اور حماد شاکر کو بنایا تھا، لیکن ۱۴ر اگست ۲۰۰۷ء کو ہندوستان کا ویزہ ہمیں نہیں ملا۔

۵.... ۳ر جولائی ۲۰۰۸ء کو مجھے مرکز دعوۃ الجالیات (کویت) حاضر ہونے کی دعوت دی گئی اور میں وہاں گیا۔ کویت کے اخباروں میں میرے متعلق مضامین شائع ہوئے، وہاں قرطبہ ہال میں مجھے ''مؤرخ اہل حدیث'' کے خطاب اور شیلڈ سے نوازا گیا۔

۶.... ۱۶ر اگست ۲۰۰۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر ۱۰۶ ر راوی روڈ لاہور میں منعقدہ تقریب میں مجھے شیلڈ عطا کی گئی۔ اس موقع پر متعدد حضرات نے تقریریں کیں جو میرے لیے حوصلہ افزائی کا باعث تھیں۔

۷.... ۱۱ر جنوری ۲۰۰۹ء کو ہمدرد ہال (لاہور) میں حافظ احمد شاکر اور ان کے صاحبزادوں (شاکرین) کی طرف سے تقریب کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر مجھے شیلڈ دی گئی۔

۸.... ۱۱ر اپریل کو مجھے میرے دوست حافظ محمد اسلم حنیف اور قاری عبیداللہ صاحب نے لیاقت پور (ضلع رحیم یار خان) حاضری کی دعوت دی۔ وہاں جامعہ محمدیہ مرکز اہل حدیث میں خاصا مجمع تھا، جس میں تقریریں ہوئیں اور جامعہ کی طرف سے میری بعض کتابیں بھی تقسیم کی گئیں، جن کی قیمت ستر ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس موقع پر مجھے شیلڈ دی گئی۔

۹.... ۳ر مئی ۲۰۱۵ء کو جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر جامعہ کے اساتذہ گرامی نے تقریریں کی، اس موقع پر مجھے شیلڈ دی گئی۔

۱۰.... جولائی ۲۰۱۵ء میں پیغام ٹی وی کی طرف سے مجھے شیلڈ عطا ہوئی۔

۱۱.... کچھ دوست کافی عرصے سے آزاد کشمیر حاضر ہونے کے لیے فرما رہے تھے، لیکن میں معذرت کر رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے ضلع نیلم کے موضع ''آٹھ مقام'' میں ۱۵ر ستمبر ۲۰۱۵ء کو سیرت کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ اور اشتہار میں میرا نام بھی لکھ دیا اور عزیزی ابوبکر (گوجرانوالہ) نے مجھ سے بار بار رابطہ کیا۔ ۱۴ر ستمبر کو وہاں قاری قمرالدین سے ملاقات ہوئی، جو درحقیقت موضع آٹھ مقام کے رہنے والے ہیں اور سارا انتظام انہیں کی کوشش سے ہوا تھا۔ ہم لوگ ابوبکر کی رفاقت میں آٹھ مقام

پہنچے۔ وہاں مجھے ۱۵ ستمبر کو شیلڈ عطا کی گئی۔ اس طرح یہ گیارہ شیلڈیں ہوئیں۔

**سوال: کیا اب تک کسی طالب علم نے آپ کی شخصیت اور فن پر مقالہ وغیرہ لکھا؟**

**جواب:** میرے متعلق اب تک دو مقالے لکھے گئے ہیں۔ ایک مقالہ فیصل آباد کے ایک کالج کی پروفیسر فوزیہ سحر ملک نے پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ''محمد اسحاق بھٹی کی خاکہ نگاری'' کے عنوان سے لکھا، جس کے گائڈ ڈاکٹر ضیاء الحسن تھے، یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ دوسرا مقالہ پروفیسر ابوانس عبداللہ نے ''محمد اسحاق بھٹی فقہائے ہند کے تناظر میں'' کے عنوان سے لکھا۔ اس کے گائڈ پروفیسر ڈاکٹر محمد حماد لکھوی تھے۔ مقالہ نگاروں کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے دونوں مقالوں پر ڈگریاں مل چکی ہیں۔

یونیورسٹی کی سطح کے ان مقالوں کے علاوہ میرے بارے میں پاکستان اور ہندوستان کے اہل علم نے بہت سے مضامین لکھے جو مولانا محمد رمضان یوسف سلفی نے ایک کتاب میں جمع کر دیے ہیں، جس کا نام ''محمد اسحاق بھٹی حیات وخدمات''۔ یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ (ناشر مکتبہ رحمانیہ ناصر روڈ سیالکوٹ)

**سوال: تحریر کے میدان میں آپ کے شاگرد کون کون سے ہیں؟**

**جواب:** میں نے کسی کو کیا شاگرد بنانا ہے، میں تو خود شاگرد ہوں اور اہل علم سے سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض دوست البتہ کہہ دیتے ہیں کہ انہوں نے میرے اسلوب تحریر سے فائدہ اٹھایا ہے، یہ ان کی مہربانی ہے۔

**سوال: تحریک ختم نبوت کے کون کون سے کردار آپ کی نظر میں بلند مرتبے پر فائز ہیں؟**

**جواب:** تحریکِ ختم نبوت کے ۲ دور ہیں۔ ایک ۱۹۵۳ء کا اور ایک ۱۹۷۴ء کا۔ ۱۹۵۳ء کے دور میں حکومت نے اس تحریک میں حصہ لینے والوں پر بہت سختی کی تھی۔ بے شمار لوگوں کو گرفتار کیا گیا اور وہ طویل عرصے تک جیلوں میں رہے۔ لاتعداد لوگوں پر گولیاں چلائی گئیں اور وہ درجہ شہادت کو پہنچے۔ اس میں حصہ لینے اور تکلیفیں جھیلنے والے باہمت اور بلند کردار لوگ تھے۔ ۱۹۷۴ء کی تحریک میں بھی گرفتاریاں عمل میں آئیں، لیکن بالآخر اللہ نے کامیابی عطا فرمائی اور مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا دور حکومت تھا۔ اس کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ہم عاجز بندوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں ان کی مغفرت فرما دی ہے۔ یہ ۹۰ سال سے اٹکا ہوا مسئلہ تھا۔ ان تحریکوں میں جس نے بھی حصہ لیا، ہمارے نزدیک سب حضرات لائق تعریف ہیں اور ہم ان تمام کرداروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

**سوال: فرقہ وارانہ تعصب کو کم یا ختم کس طرح کیا جا سکتا ہے؟**

**جواب:** میرے خیال میں جو حالات روز بروز پیدا ہو رہے ہیں ان میں فرقہ وارانہ تعصب کو کم یا ختم کرنے کے لیے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ سے دعا مانگنے کی ضرورت ہے۔ آپ بھی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں، میں بھی مانگوں گا، عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

**سوال: عام آدمی میں مطالعہ کا شوق کس طرح پروان چڑھایا جا سکتا ہے؟**

**جواب:** مطالعہ کے لیے کوشش کی جائے اور کتاب کو مرکزِ توجہ بنا لیا جائے تو اس میں آہستہ آہستہ شوق کا عنصر شامل ہو سکتا ہے اور پروان بھی چڑھ سکتا ہے۔ اگر اس طرف دھیان ہی نہ کیا جائے تو نہ شوق پیدا ہوگا اور نہ کچھ پروان چڑھے گا۔ بچوں کو ابتدا ہی میں اس طرف توجہ دلانا چاہیے، لیکن ہم تو انہیں ڈرامے اور فلمیں دکھانے کے لیے ٹی وی کے سامنے بٹھا دیتے ہیں، مطالعہ کا شوق کیسے پیدا ہوگا؟

**سوال: بحیثیت مصنف، مؤلف اور مدیر، پیام آگہی کے اجراء اور اب تک کے سفر اور اس کی بہتری کے بارے میں کیا کہیں گے؟**

**جواب:** میں ''پیام آگہی'' کی ہر سطر پڑھتا ہوں اور اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح دیکھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ بہترین رسالہ ہے، اس میں بچوں اور نوجوانوں سب کے لیے خوبصورت مضامین موجود ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی اس میں بڑا مواد ہے، اس کی چھپائی، کمپوزنگ اور کاغذ کا معیار بھی قابل قدر ہے۔ میں اپنے محدود تصنیفی اور ادارتی تجربے کی بنا پر اسے اپنے ملک کا بہترین ماہنامہ قرار دیتا ہوں۔ اس کے مندرجات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ادارتی ٹیم بڑی محنت سے اس کو مرتب کرتی ہے۔ اللہ ان سب دوستوں کو اجر عطا فرمائے جو اتنا اچھا مواد ہمیں ہر مہینے پہنچاتے ہیں۔

**سوال: پیام آگہی کے قارئین کو کیا پیغام دینا پسند کریں گے؟**

**جواب:** میں ''پیام آگہی'' کے خواندگانِ محترم کی خدمت میں نہایت ادب سے درخواست کروں گا کہ خود بھی علم وعمل کی اس حسین وادی کی سیاحت کو اپنا معمول بنا لیں، اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو بھی اس راہ پر چلنے کی تلقین کریں۔ مطالعہ کو اپنے لیے ضروری قرار دیں اور بچوں کو ابتدائی عمر ہی سے اس آشنائی کا سبق دیں۔ قرآن کے مجید پڑھنے کا حکم دیا ہے اور قلم کو اس درجے احترام سے نوازا ہے کہ اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے، والقلم ومایسطرون۔ آپ پڑھنے لکھنے کو اپنے شب و روز کا شیوہ بنائیں اور زندگی کے ہر لمحے کو لکھنے پڑھنے کے لیے وقف کر دیں۔ آپ پیام آگہی کا مطالعہ کریں گے تو اس سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ وقت بہت بڑی دولت ہے، اسے ضائع نہ کریں، گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان بن جائیں۔

☆☆☆

# سوانحی خاکوں میں مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کا اسلوب نگارش

یاسر اسعد بن اسعد اعظمی (متعلم جامعہ سلفیہ بنارس)

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ (۱۹۲۵-۲۰۱۵ء) کا شمار برصغیر کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ وسیرت کے فن کو خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرایا اور اس میدان میں بسیار نویسی کے ساتھ اعلیٰ ادبی نقوش بھی چھوڑے۔ آپ کی تحریروں کو پڑھنے والا شخص ایک طرف جہاں جماعت اہل حدیث کی تاریخ کے سنہرے موتی اپنے دامن میں سمیٹتا ہے وہیں پر ادب ولطافت اور بلاغت ومعانی وبیاں کے گلکدے سے خوشہ چینی بھی کرتا ہے۔ افسوس کہ قلم وقرطاس کی دنیا کا یہ عظیم شہسوار ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

مختلف علماء ومحدث وقت علامہ حافظ محمد گوندلوی اور شیخ الحدیث علامہ محمد اسماعیل سلفی رحمہما اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں جامعہ محمد فیروز پور سے تدریس کا آغاز فرمایا۔ تحریک آزادی ہند میں پیش پیش رہے اور اس ''جرم'' میں قید کی سزا بھی کاٹی۔ تقسیم ہند کے المناک حادثے کے بعد پاکستان میں جماعت اہل حدیث کی تنظیم نو کے بعد آپ کو جمعیت کے دفتر کا ناظم بنایا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں جمعیت کے ہفت روزہ آرگن ''الاعتصام'' کے اجراء کے بعد آپ کو نائب مدیر مقرر کیا گیا اور بعد ازاں آپ اس کے مدیر اعلیٰ بھی ہوئے۔ اسی دوران اپنا سہ روزہ اخبار ''منہاج'' بھی جاری کیا۔ الاعتصام سے علاحدگی کے بعد لاہور سے ہفت روزہ ''توحید'' کا اجراء کیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے مایہ ناز ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے اور متعدد علمی خدمات انجام دیں۔

علامہ بھٹی مرحوم نے پنجاب یونیورسٹی کے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں مختلف موضوعات پر ۵۰ر سے زائد مقالے تحریر کیے جو دو سو سے زائد صفحات پر محیط ہیں۔ عرصہ دراز تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہ کر صراط مستقیم، صحابہ کرام کے حالات، بزرگان دین کے واقعات، سیرت طیبہ، آیات بینات وغیرہ مختلف موضوعات پر تقریریں نشر کیں۔ سرکاری ٹی وی چینل PTV پر بھی مختلف موضوعات پر آپ کا خطاب ہوا۔ پاکستان کے مشہور روزنامہ ''امروز'' میں کئی سالوں تک برابر جمعہ اور اتوار کو خصوصی مضامین تحریر فرماتے رہے۔ ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور میں متعدد شخصیات پر خاکے لکھے۔ آپ کی خاکہ نگاری پر پروفیسر فوزیہ ظفر نے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا۔ ''مولانا اسحاق بھٹی کی سوانح نگاری - فقہائے ہند کے تناظر میں'' کے موضوع پر ڈاکٹر محمد انس سرور نے پنجاب یونیورسٹی میں ایک مقالہ لکھا۔ اس کے علاوہ آپ کی حیات وخدمات پر متعدد پی ایچ ڈی وغیرہ کے مقالے لکھے گئے۔ عمر عزیز کی ۹۱ر بہاریں دیکھ کر ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۵ء کی صبح آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا کا قلم سب سے زیادہ علمائے اہل حدیث کی سوانح نگاری کے لیے مشہور ہے۔ اگر چہ کچھ دوسرے موضوعات پر بھی آپ نے قلم کی جولانیاں دکھلائی ہیں، مگر سوانح نگاری کے باب میں آپ کی تحریریں مرجع ومصدر کی حیثیت رکھتی ہیں جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ آپ کی تصنیف ''دبستان حدیث'' کے ص: ۷ پر حرف اول کے تحت ناشر کتاب جناب عمر فاروق قدوسی رقمطراز ہیں:

''سفر کی صعوبتوں اور پے در پے رکاوٹوں کے باوجود ان کا اشہب قلم رواں دواں ہے۔ اس تحقیقی وتصنیفی زندگی میں انہیں کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور پھر وہ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ قلم کی توانائی عموماً بہت کم ہو جاتی ہے لیکن ان پر اللہ رب العزت کا خاص کرم ہے کہ چند سالوں میں ان کی درجن بھر کتب شائع ہو چکی ہیں اور ہر کتاب کم از کم پانچ چھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ وطن عزیز کے معروضی حالات بھی سب کے سامنے ہیں۔ ایسے ابتر حالات میں قلم کو اپنا رفیق زندگی بنائے رکھنا بھی حضرت بھٹی کی کرامت ہے۔ اس سارے تصنیفی وتحقیقی کام میں ان کا کوئی معاون نہیں۔ وہ اکیلے یہ کام کرتے ہیں۔ کسی کو املا نہیں کراتے، کوئی ان کے لیے حوالے تلاش نہیں کرتا، کوئی ان کے لیے لائبریریوں کے چکر نہیں کاٹتا کہ جا کر لائبریری سے کتاب لے آئے اور بھٹی صاحب کا قیمتی وقت بچ جائے۔''

مولانا محمد اسحاق بھٹی کی پیدائش ۱۵ر مارچ ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آپ کا زمانہ قابل رشک ہے۔ جماعت اہل حدیث کے اکابرین مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا محمد جونا گڑھی اور پھر دوسرے طبقے کے اجیال مثلاً مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد گوندلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا محمد حنیف ندوی رحمہم اللہ جیسے رہبران قوم وملت کا ہم عصر ہونا ہی عز وشرف کی بات ہے۔

مولانا اسحاق بھٹی کی تصنیفات کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے، جن میں اکثر علمائے اہل حدیث کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس قسم کی کتابیں دو طرح کی ہیں:

۱- پہلی قسم ان کتابوں کی ہے جن میں مولانا نے اپنی دیدہ وشنیدہ ہستیوں کے مکمل احوال وکوائف لکھے ہیں۔ بزم ارجمنداں اور نقوش عظمت رفتہ وغیرہ اسی

خاکہ نگاری کی نوع سے متعلق ہیں۔ اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ مولانا نے ان کی شخصیت سے متعلق جو بھی باتیں ذہن میں تھیں وہ صفحۂ قرطاس پر نقل فرمادی ہیں اور بہت تفصیل سے ان کی ہستی پر روشنی ڈالی ہے۔

الکتاب انٹرنیشنل دہلی سے شائع بزم ارجمنداں کے ابتدائیہ میں مرقوم ہے کہ:

''بھٹی صاحب کا اسلوب نگارش ایسا دلچسپ ہے کہ قاری اسے پڑھنا شروع کرے تو اس میں جذب ہوجاتا ہے۔ وہ جس شخصیت پر لکھتے ہیں اس کا پورا سراپا اپنے قارئین کے سامنے لے آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس شخصیت کو اس کی تمام عادات واطوار اور عملی سرگرمیوں کے ساتھ اپنے روبرو کھڑا اسے دیکھ رہا ہے اور اس سے محوِ گفتگو ہے۔

لکھنے کا یہ انداز کم ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ اللہ کی یہ بہت بڑی نعمت ہے جو بھٹی صاحب کو عطا فرمائی گئی ہے۔'' [بزم ارجمنداں، ص:۵]

اس موقع سے ان ہستیوں کی خدا ترسی، خشیت الٰہی، رحمت وشفقت اور ذرہ نوازی پر بسا اوقات آنکھیں نم ہوجاتی ہیں۔ اس کی بہترین مثال جماعت اہل حدیث کے موقر صدر مولانا محمد داود غزنوی مرحوم کا خاکہ ہے جس کی تکمیل کرتے کرتے مولانا نے پڑھنے والے کو رونے پر مجبور کردیا۔ اس کا ایک خاصہ اور ہے کہ قاری اس صورت حال کا اپنے زمانے کے علماء سے مقارنہ کرتا ہے اور یہاں اسے شدید مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ مزید اسے اکابرین کی اعلیٰ شخصیت سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ چونکہ مولانا نے ان کبار ہستیوں سے شرف لقاء وسماع حاصل کیا تھا اس لیے اپنی آنکھوں دیکھی روداد جماعت کے ماضی کی خوشگوار صورت حال سامنے لاتی ہے جہاں ہمیں مولانا آزاد، مولانا امرتسری، مولانا سیالکوٹی، مولانا جونا گڑھی، مولانا مودودی وغیرہم کی محفل دانشمنداں کے دلچسپ واقعات بھی ملتے ہیں اور ان علماء کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا نے اس سلسلے میں مسلکی تعصب یا مذہبی منافرت کو آڑے نہیں آنے دیا اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بعض غیر اہل حدیث بلکہ غیر مسلم ہستیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور وسعت قلبی کے ساتھ ان کی خوبیوں کو بیان کیا ہے، چنانچہ مرزا ادیب لکھتے ہیں:

''آدمی بیسیوں شخصیتوں کو موضوع گفتگو بنائے تو وہ کوشش کے باوجود کہیں نہ کہیں اپنی عصبیت کا اظہار کردیتا ہے۔ یہ عمل غیر شعوری ہوتا ہے، لیکن بھٹی صاحب ہر جگہ مسکراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک بدستور برقرار رہتی ہے۔ ان کی ''اپنائیت'' کا بھی یہی عالم ہے۔ ''غیریت'' ان کے یہاں کہیں بھی اپنی ناگوار جھلک نہیں دکھاتی۔'' [بزم ارجمنداں، ص:۱۵]

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں کہ ''اہل حدیث کو عام طور پر متعصب اور تنگ نظر کہا جاتا ہے۔ اگرچہ مستثنیات سے قطع نظر یہ ان کی دینی عصبیت، اسلامی حمیت اور دین داری کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کتاب (نقوش عظمت رفتہ اور بزم ارجمنداں) کے مصنف نے اس خیال کا بھی ایسا بطلان کیا ہے کہ شاید اب اہل حدیث پر کوئی شخص یہ الزام نہ لگا سکے۔ ایک ہزار دوسو انہتر صفحات کی دو کتابوں میں ایک مقام بھی ایسا نہیں کہ انہیں اس الزام کا مورد قرار دیا جاسکے۔ ان کا قلم ہر کسی کے ذکر میں مؤدب اور مہذب رہا ہے۔ اگر کہیں طنز ہے تو بلا تفریق اور نہایت لطیف۔ اگر ایسے مقامات کا شمار کیا جائے، جہاں انہوں نے طنز سے کام لیا ہے یا کسی شخصیت کے کسی مضحک پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے تو ان کے اہداف کی دوسرے افراد سے اہل حدیث کی تعداد زیادہ ہوگی۔'' [نقوش عظمت رفتہ / بزم ارجمنداں، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، الاعتصام، ۷ر جنوری ۲۰۰۰ء]

۲- دوسری قسم مختصر تذکروں پر مشتمل ہے جن میں آپ نے تذکرہ نگاری کے معروف طرز پر علمائے اہل حدیث کی خدمت کتاب وسنت پر روشنی ڈالی ہے۔ قابل تعریف بات ہے کہ مولانا نے علمائے اہل حدیث کی خدمت قرآن کو بھی اجاگر کیا اور ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف فرمائی، ورنہ اس پہلو کو عام طور سے کم ذکر کیا جاتا ہے اور علمائے اہل حدیث کی خدمات حدیث ہی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

اس باب میں مولانا کی تحریریں منفرد اسلوب کی حامل ہیں، ادبیت سے بھرپور سوانح نگاری کے مطالعہ کا مزا ہی کچھ اور ہے جس کا ادراک قاری ان تحریروں سے کر سکتا ہے۔ مولانا نے مرحومین کے ساتھ موجودین کا بھی تذکرہ کیا ہے، دیکھا جائے تو موجودین میں اکثر لوگ آپ کی اولاد بلکہ پوتوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان حضرات کا تذکرہ مولانا کے قلم سے ان کے لیے یقیناً شرف کی بات ہوگی۔ اس سے مولانا کی خاکساری واضح ہوتی ہے۔ اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت بھرا رویہ دراصل مولانا کے مزاج کا خاصہ رہا ہے جس کا احساس اس حقیر کو بھی ایک موقع پر ہوچکا ہے اور بہت سارے اہل علم نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

بسا اوقات بعض شخصیات کے بارے میں حیران کن انکشافات بھی کرتے ہیں۔ تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ مولانا نے پاکستان میں رہتے ہوئے بعض ہندوستانی علماء کے تعلق سے بہت ساری باتیں ایسی لکھی ہیں جن کا علم خود ہندوستانی علماء کی تحریروں سے نہیں ہوتا۔ شخصیات کے متعلقہ علاقوں کی جغرافیائی حالت کے ساتھ ساتھ وجہ تسمیہ بھی ذکر فرماتے ہیں۔ (بقیہ ص:۲۶/پر)

# میرے پیارے ابو جی (مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ)

سمیہ زریک (دختر مولانا محمد اسحاق بھٹی)

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب جن کو دنیا مؤرخ اسلام، مذہبی اسکالر، ذہبیٔ دوراں، تحریک آزادی کے عظیم سپاہی، محسن ومؤرخ اہل حدیث، یادگار اسلاف، نامور ادیب، شہسوار قلم جیسے ناموں سے جانتی ہے، لیکن میں یہاں صرف ان کا تعارف ایک والد کی حیثیت سے کرانا چاہتی ہوں، وہ ایک عظیم والد تو تھے ہی، وہ بہت ہی شفیق، خوش گفتار ملنسار انسان بھی تھے۔ ان سے جو بھی کوئی ایک بار مل لے تو وہ ان سے بار بار ملنے کی خواہش رکھتا تھا اور ہر انسان ان سے ملنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ بھٹی صاحب صرف ان سے ہی اتنی محبت کرتے ہیں۔ کوئی امیر ہو یا غریب ان کا ہر ایک سے ملنے کا انداز ایک ہی ہے۔ ان کے بڑے بڑے سیاست دانوں سے بہت اچھے تعلقات رہے، لیکن انھوں نے ان تعلقات کو کبھی کیش نہیں کرایا۔ جو کوئی بھی ان سے ملنے آتا وہ گھر ہوں، دفتر یا باہر کسی بھی جگہ پر ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ کھانا کھائے بغیر نہ جائے اور وہ اس کوشش میں سو فیصد کامیاب بھی رہے۔

بچپن سے انبیاء کرام اور صحابہ کرام کے قصے کہانیاں اور واقعات سنایا کرتے۔ ان واقعات سے ہی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ یعنی اگر میں کوئی غلط کام یا بات کرتی تو ڈانٹتے نہیں بلکہ یہ ان کے سمجھانے کا طریقہ تھا تاکہ اب میں یہ غلط کام نہ کروں۔

اسکول کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میری شادی بہاول نگر ہوئی۔ میرے شوہر کا نام بھی محمد اسحاق بھٹی ہے اور وہ میرے ساتھ میرے والدین کی محبت کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ میرے بچوں کے نام بھی میرے ابو جی نے رکھے، بیٹوں کے نام محمد نعمان اسحاق، محمد عویمر اسحاق، محمد ذکوان اسحاق اور محمد نوفل اسحاق اور بیٹیوں کا نام بریرہ اسحاق، قانتہ اسحاق رکھا۔

میرے میاں ابو جی کو والد کا درجہ دیتے ہیں اور یہ بات برملا کہتے اور بار بار کہتے ہیں، جو پیار مجھے چاچا جی (ابو جی) اور پھوپھو جی (امی جی) نے دیا ہے، وہ پیار مجھے میرے والدین نے بھی نہیں دیا۔ میں جب یہ بات اسحاق صاحب کے منہ سے بار بار سنتی ہوں تو میرا سینہ خوشی سے تن جاتا ہے اور میرے دل میں بھی میرے شوہر کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ شاید میں یہ بات کسی دوسرے کے والدین کے بارے میں کبھی نہیں کہہ سکتی۔

ہم جب جب لاہور آتے چند دن کے بعد یا کچھ عرصے کے بعد ابو جی ہمیشہ کھڑے ہو کر بہت پرتپاک طریقے سے ملتے، وہ ہمیشہ اپنے دینی اور علمی کاموں میں رہتے، لیکن ہمارے آنے پر اپنا کام چھوڑ کر ہمارے پاس بیٹھتے، پھر دن بھی گزر جاتا اور رات بھی مگر وقت کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔ ان کا انداز گفتگو ہی ایسا ہے کہ ابو جی بولتے ہیں تو جی چاہتا ہے وہ بولتے جائیں اور ہم سنتے جائیں۔

افسوس تو یہ ہے کہ اب نہ مجھے کوئی فون کرے گا اور نہ ہی میں انتظار، اب میرے لیے میرے بچوں کے لیے کون دعا کرے گا؟ ابو جی کے ہر سانس سے میرے لیے دعا نکلتی تھی، میں ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی ہوں۔ میں شاید اپنے الفاظ میں ان کے لیے تھے کا لفظ استعمال نہیں کر سکتی، اس لیے میں ہر جگہ پر ان کے لیے ہے کا لفظ استعمال کیا ہے۔

کچھ حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں دماغ تو تسلیم کرتا ہے لیکن دل نہیں۔ شاید یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آپ سے گزارش ہے کہ میرے ماں باپ کے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ان کی آخری آرام گاہ کو جنت کا باغ بنا دے اور مجھے جنت میں اپنے پیارے ماں باپ کا ساتھ نصیب ہو۔ آمین۔ ثم آمین

☆☆☆

## اہل قلم سے گزارش

- مضامین مدلل، جامع اور مختصر ہوں۔
- مضامین منہج کتاب وسنت سے ہم آہنگ ہوں۔
- جماعتی خبریں اور عام رپورٹ وغیرہ مبنی بر صداقت ہوں۔
- مضمون خوش خط یا ٹائپ شدہ ہو جسے ایمیل کے ذریعہ بھی بھیج سکتے ہیں۔

امید کہ اہل قلم حضرات مذکورہ گزارشات کا لحاظ رکھیں گے۔ آپ کے قیمتی مضامین کا انتظار رہے گا۔

(ادارہ)

# میرے مولانا (مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ)

محمد نعمان اسحاق (نواسہ مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ)

کہتے ہیں کہ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے، اگر اس تسلسل میں محنت، ہمت، مستقل مزاجی، جوش، جذبہ اور بلند حوصلے جیسے عناصر شامل ہو جائیں تو پھر انسان کو آگے بڑھنے اور اپنے خوابوں کی تکمیل تک پہنچنے کے لیے دنیا کی کوئی طاقت آڑے نہیں آسکتی۔ بس کچھ ایسی ہی خصوصیات کے حامل تھے میرے مولانا، جی ہاں! میرے مولانا سے میری مراد مولانا محمد اسحاق بھٹی ہیں۔ میں انھیں بطور نانا ''ابو جی'' کے نام سے پکارتا تھا، لیکن اکثر اوقات سنجیدہ موضوعات اور ان کے علمی تدبر سے استفادہ کرنے کے دوران گفتگو میں انھیں مولانا کے نام سے بھی پکارا کرتا تھا اور بعض دفعہ بحیثیت دوست بے تکلفانہ انداز میں بھی۔ میرا علمی ذوق اتنا بلند نہیں کہ میں مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب جیسی بلند پایہ شخصیت کے بارے میں ایک حرف بھی لکھ سکوں، نہ ہی میں اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا ہوں۔

مولانا ہمہ گیر خصوصیات کی حامل ایک مکمل شخصیت تھے۔ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کا شوق ہوتا ہے، پر شاید مولانا کو جنون تھا اور یہ جنون ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ان پر سوار رہا۔ آپ اس جنون کی تپش کا اندازہ کیجیے کہ زندگی کی ڈور کٹنے سے قبل جب وہ ہسپتال میں آخری سانسیں لے رہے تھے اور ڈاکٹرز نے انھیں زیادہ بولنے اور کسی سے ملنے سے منع کر دیا تھا اس حالت میں بھی انھوں نے فون کر کے بتایا کہ فلاں الماری میں فلاں جگہ پر جو دو کتب ہیں وہ لے کر آؤ۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ لکھنا ان کی بھوک تھی اور پڑھنا پیاس، اسی لیے قریباً پچاس ہزار سے زائد اوراق لکھنے اور ان کی لائبریری میں دس ہزار سے زائد کتب موجود ہونے کے باوجود ان کی لکھنے کی بھوک ختم ہو سکی اور نہ ہی پڑھنے کی پیاس کم۔

عام طور پر عمر کے ساتھ انسان کی ترجیحات، مزاج، کام کرنے کی سکت، ہمت جوش ولولے اور حوصلے میں تبدیلی اور کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا دوران زندگی وقت کی جس ریل گاڑی میں سوار تھے جو ہر گزرتے ہوئے لمحے، منٹ، گھنٹے، دن، ہفتے، مہینے، سال کے ساتھ مزید تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی عمر اور کام کرنے کی رفتار کو دیکھ کر بظاہر لگتا تھا کہ وہ وقت کہیں ان کے لیے ٹھہر سا گیا ہے۔ آئن سٹائن کے قانون کے مطابق اگر انسان ایک خاص رفتار سے زیادہ رفتار میں سفر کرے تو وقت اس کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے اپنے کام کرنے کی رفتار کو آئن سٹائن کی بتائی ہوئی اس خاص رفتار سے تیز کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے مضمون نگاری، ادب، تاریخ اور تحقیق کے میدان میں تن تنہا بطور فرد جو کارہائے نمایاں سر انجام دیے وہ کئی افراد، جماعتیں، تنظیمیں ادارے اور یونیورسٹیاں بھی کرنے سے قاصر دکھائی دیتی ہیں۔ میں جب بھی ان سے ملتا مجھے ان کی آنکھوں میں مصمم ارادوں کی چمک دکھائی دیتی، یہی وجہ ہے کہ زندگی کی نوے بہاریں دیکھنے، بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے، بچپن سے جوانی اور بڑھاتے تک والدین، بہن بھائیوں، زوجہ کے انتقال اور مختلف نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے باوجود نہ تو ان کے آگے بڑھنے کی آگ ٹھنڈی ہوئی، نہ ہی پایۂ استقلال میں لغزش آئی اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں موجود مصمم ارادوں کی چمک ماند پڑی۔

میں نے کبھی انھیں مسلسل پانچ سے چھ گھنٹے تک سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ سارا دن کاغذ قلم پکڑ کر کام کرتے اسی دوران اگر کوئی ملاقات کے لیے حاضر ہوتا تو کبھی انکار نہیں کرتے اور ہر بار ملنے سے ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ جیسے پہلی بار مل رہے ہیں، خواہ آخری ملاقات چند گھنٹے تو کیا چند لمحے ہی پہلے ہوئی ہو اور وہ شخص ملاقات کے دوران اپنی کوئی چیز میز پر بھول گیا اور اسی اثناء میں دوبارہ حاضر ہوا ہو۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد کام کرتے، پھر سو جاتے اور صبح تہجد تک دو سے تین بار مختلف نشستوں میں بار بار کام کرتے۔ تہجد کی نماز کے بعد اللہ کے حضور عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر، زار و قطار آنسوؤں کے ساتھ ایسی دعا مانگتے کہ اکثر ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے مجھ سمیت گھر کے افراد جاگ جاتے۔ اسی دعا میں خاندان کے ایک ایک فرد کا نام لیتے، ساتھ اگر کسی دوست یا ہمسائے نے کوئی مشکل بتائی ہو تو اس کو بھی شامل کرتے اور اپنی بخشش کا بھی سوال کرتے۔

مولانا بڑوں اور بچوں سمیت سب کو دوران گفتگو آپ کہتے، تم، تو تڑاں سے یکسر گریز کرتے۔ خوراک کافی کم تھی، بس زندہ رہنے کے لیے کھاتے۔ کھانے میں جب بھی جو بھی ملتا صبر شکر کر کے کھا لیتے اور کھانے کے دوران یا بعد میں کبھی نمک یا مرچ کے زیادہ ہونے یا کم ہونے کا گلہ نہ کرتے۔ جس محفل میں بھی حاضر ہوتے اس محفل کی روح رواں ہوتے۔ سنجیدہ موضوعات کی گفتگو اور یہاں تک کہ تقاریر میں بھی اپنی مزاح نگاری کی بدولت ایسے ایسے رنگ بھرتے کہ حاضرین خوب محظوظ ہوتے ہوئے بڑی دلچسپی سے بات سنتے۔

مولانا کے متعلق چند سطریں انہی کی نشست پر بیٹھا تحریر کر رہا ہوں۔ مزید باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں، لیکن اب یہ دل ان کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں کی چار دیواری میں سمٹی ہوئی یادوں کے سمندر میں پوری طرح کچھ ایسے غوطہ زن ہو گیا ہے کہ ان بھیگی ہوئی آنکھوں میں صرف ان کی تصویر نظر آ رہی ہے اور قلم بھی چلنے سے قاصر ہے۔ بقول شاعر

بتوں پہ جا کے دل مبتلا نہیں ہوتا　　پکارتا ہوں تو کہتا ہے جا نہیں آتا

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ابو جی (نانا) کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور انھیں جنت الفردوس میں انبیاء کرام اور ان تمام نیک شخصیات کا ساتھ نصیب فرمائے۔ جن کے بارے میں آخری سانسوں تک ان کا قلم چلتا رہا۔ آمین

# آہ! مولانا محمد اسحاق بھٹی بھی گزر گئے، چند یادیں چند آثار

عرفان جعفر خان

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ نامور ادیب اور مورخ تھے۔ قدیم علمائے کرام کی یادداشتوں کا بیش بہا خزانہ ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ خوش مزاج، ملنسار اور مہمان نواز تھے۔ بہت ہی سادہ طبیعت کے مالک تھے۔ ۹۱ ؍برس کی عمر میں بھی وہ کسی کے محتاج نہیں ہوئے۔ ایک دن علالت اور پھر اچانک ناگہانی موت ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔

ان کے قلم نے کبھی قرار نہیں پایا، آخری وقت تک تصنیفی کام جاری تھا۔ جو بھی ان سے ایک بار ملا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہ محفل کی جان تھے، ہر فرقے اور طبقے سے میل جول رکھتے۔ کسی کا برا نہ مناتے۔ مختلف شخصیتوں پر بھی لکھا مثلاً شیخ قمرالدین صاحب پر لکھا تو ایسی خاکہ نگاری کی کہ ان کی شخصیت نکھر کر سامنے آ گئی۔

نئے محقق اور تاریخ دان پیدا ہونا تو دور کی بات، نئی نسل اگر انہی کی علمی خدمات سے استفادہ کرلے تو بہت بڑی بات ہے۔ جانا سبھی کو ہے لیکن اگر کوئی زندگی اور موت کی حقیقت جاننا چاہتا ہے تو ایک لمحے کیلئے سوچ لے کہ وہ کیا لے کر گیا اور کیا چھوڑ کر جا رہا ہے۔ حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔

مولانا اسحاق بھٹیؒ کو اعزاز حاصل تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے منعقدہ ۲۵/۲۶ ؍اگست ۱۹۴۱ء کے تاسیسی اجلاس کے عینی شاہد تھے۔ وہ اگرچہ جماعت اسلامی میں باقاعدہ شامل نہیں ہوئے تھے تاہم وہ تمام عمر جماعت اسلامی کی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ سے میرا پہلا تعارف کتاب "تذکرۃ النبلاء فی تراجم العلماء" از عبدالرشید عراقی سے ہوا جس میں یہ لکھا کہ وہ جماعت اسلامی کے تاسیسی اجتماع میں شریک ہوئے۔ پھر میں نے مولانا مودودیؒ کے ذاتی معاون بشیر احمد بٹؒ سے ان کی رہائش گاہ معلوم کر کے حاضر خدمت ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چلتا رہا جو ان کی وفات کے چند دن قبل تک جاری رہا۔

ممتاز سکالر پروفیسر ظفر حجازی صاحب ہمیشہ اسحاق بھٹی صاحب کا احترام کرتے اور میری جب بھی ملاقات ہوئی تو بھٹی صاحب کا حال احوال ضرور پوچھتے اور ہمیشہ کہتے کہ بھٹی صاحب کی باتیں بہت قیمتی ہیں ان کو نوٹ کرلیا کرو۔ وفات سے چند دن پہلے تک پروفیسر محمد ایوب منیر کی شدید خواہش تھی کہ ان کے ساتھ ناشتے پر ایک نشست رکھی جائے مگر انہوں نے کہا کہ کچھ تصنیفی کام کر رہا ہوں اس لیے کچھ دن بعد رکھ لینا۔

لیاقت بلوچ صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان سے اسحاق بھٹی صاحب کا تذکرہ کیا کہ آپ کی ان سے فون پر بات کروانی ہے تو لیاقت بلوچ صاحب نے کہا کہ وہ بزرگ ہیں، ان سے میں خود ملنے جاؤں گا۔

بھٹی صاحب اکثر کہا کرتے تھے تم نے مجھے زیادہ مشہور کر دیا ہے تو میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں تو میں آپ کی خوبیوں کا تذکرہ لوگوں سے کیوں نہ کروں۔ مولانا اسحاق بھٹیؒ نے عبدالوکیل علوی صاحب کی شخصیت اور ان کے علمی کام پر تفصیلی مضمون لکھ دیا ہے۔ مولانا مودودیؒ، میاں طفیل محمدؒ، مولانا نصراللہ خان عزیزؒ، نعیم صدیقیؒ، عبدالحمید صدیقیؒ سے ان کی بہت زیادہ یادیں وابستہ تھیں۔

ایک واقعہ جو انہوں نے مجھے سنایا کہ عبدالحمید صدیقی مرحوم ترجمان القرآن کیلئے اشارات لکھ چکے تھے انہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت آ گئی۔ وہ تمام اشارات بھٹو مرحوم کے خلاف تھے۔ صدیقی صاحب، اسحاق صاحب کا پنجاب پبلک لائبریری میں انتظار کر رہے تھے۔ جب اسحاق صاحب تشریف لائے تو صدیقی صاحب نے کہا میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ اشارات میں نے لکھ دیے ہیں اور بھٹو صاحب کی حکومت آ گئی ہے۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے ان میں جو صفحات نکالنے ہیں وہ نکال دیں، باقی میں لکھ دوں گا۔

تو اسحاق صاحب نے پڑھنے کے بعد کہا : یہ ۱۳ ؍صفحات میں سے ۸ ؍صحیح ہیں باقی ٹھیک نہیں ہیں۔ تو مجھے کہنے لگے تمہارے بزرگ مجھ پر اتنا اعتماد کرتے تھے۔ اسحاق بھٹی صاحب نے وہ واقعہ بھی مجھے سنایا جب جوش ملیح آبادی لاہور احسان دانش صاحب کے گھر آئے اور آ کر کہا کہ کسی کو پتا ہے: مودودی کے گھر کا۔ تو اسحاق صاحب نے کہا کہ مجھے معلوم ہے تو جوش صاحب کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کو کہا کہ تم بہت بوڑھے ہو گئے۔ حیدرآباد میں تو تم بڑے جوان تھے۔

بھٹی صاحب نے مجھے سنایا۔ جب جوش صاحب لاہور میں اپنی کتاب یادوں کی بارات چھپوانے کیلئے ایک اور ادارے کے سربراہ کے پاس گئے تو انہوں نے جوش صاحب کو کہا کہ یا تو آپ کی کتاب چلے گی یا ہمارا ادارہ چلے گا۔

بھٹی صاحب نے بتایا کہ مولانا مودودیؒ نے مجھے آخری ایام میں کسی کے ذریعے پیغام پہنچایا کہ مولانا مودودیؒ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ کہتے ہیں: میں ملاقات کے لیے تو نہ جاسکا البتہ نماز جنازہ میں شریک ہوا۔ میاں طفیل محمد صاحب فوت ہوئے تو اس دن سخت لو چل رہی تھی۔ (بقیہ ص: ۵۹/ پر)

# مولانا بھٹی رحمہ اللہ کے انتقال پر تعزیتی پیغامات

(ادارہ)

(مولانا بھٹی رحمہ اللہ جماعت اہل حدیث کے ہی نہیں، عالم اسلام کا قیمتی سرمایہ تھے۔ ان کا انتقال ایک عظیم سانحہ ہے، ان کے انتقال پر موصول ہونے والے، معاصر علمائے کرام کے تاثرات پیش خدمت ہیں)

● مولانا محمد اسحاق بھٹی ہمارا قیمتی سرمایہ تھے، تکلف سے دور اور شہرت سے نفور شخصیت نے لازوال کام کیا اور دنیا کو بتایا کہ جو کام کرنا چاہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے راستے آسان کر دیتا ہے، انہوں نے ٹھوس بنیادوں پر مضبوط علمی کام کیا اور تاریخ اہل حدیث کو محفوظ کر دیا۔

**مولانا عبدالہادی عمری (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی نے لاہور کے پس ماندہ علاقے کے اوسط درجے کے گھر میں بیٹھ کر جو شاندار کام کیا ہے وہ انھیں کی شخصیت کا خاصہ ہے میں نوجوان نسل خصوصا جو لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں ان سے کہوں گا کہ آسائشات کی تمنا میں وقت ضائع کرنے کے بجائے مولانا کی کتب اور مولانا کے اسلوب کو حرز جان بنائیں مولانا کی طرح سادگی کے ساتھ کام شروع کر دیں۔

**مولانا حبیب الرحمٰن (ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی میرے ان رفقاء میں سے تھے جنھوں نے دیگر علماء کی طرح میرے خاندان کی پانچ پشتوں کے احوال تحریر کیے۔ میں جب بھی پاکستان جاتا ان سے ملے بغیر واپس نہیں آتا۔ مولانا کے عادات کریمانہ اور ادائے دلبرانہ نے ہر ایک کو ان کا پروانہ بنا دیا ہے۔

**ڈاکٹر صہیب (ممتاز اسکالر)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی وفات ایک عظیم علمی فکری نقصان ہے۔ انھوں نے تاریخ کی خارزار وادی میں اتر کر فتنہ گروں کی اڑائی ہوئی گرد کو نامور شخصیات سے اس طرح صاف کیا کہ ہر چہرہ رشک آفتاب و ماہتاب نظر آنے لگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

**مولانا محمد ابراہیم میر پوری (ناظم اسلامک ریلیف برطانیہ)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی کی علمی قلمی خدمات کا احاطہ بہت مشکل ہے، انہوں نے اپنی جد وجہد اور محنت سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کی جہود جلیلہ اور مساعی جمیلہ اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین

**ڈاکٹر شیر خان جمیل احمد (ڈپٹی سیکرٹری مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی دور حاضر کی ایک یادگار تھے، آج علمی حلقے یتیم ہو گئے۔ کتابیں مولانا کا اوڑھنا بچھونا تھیں، ماضی قریب بلکہ اپنی شعوری زندگی کی مکمل تاریخ کے وہ حافظ تھے۔ بلیغ انداز تحریر میں ٹھوس علمی وفکری مضامین ایسے لکھے کہ ماضی کو حال کر دیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

**مولانا شعیب احمد میر پوری (آف برطانیہ)**

● مولانا محمد اسحاق بھٹی جیسی عبقری شخصیات واقعی صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں، میری شدید خواہش تھی کہ مولانا محمد اسحاق بھٹی کو کسی طرح ہندوستان بلایا جائے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی کا طرز فکر ایک سلیم الطبع، انصاف پسند اور حق کے متلاشی انسان کا تھا، انھوں نے تاریخ کے میدان میں آبلہ پائی کرتے ہوئے بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑا، حالانکہ شخصیات پر لکھتے ہوئے محبت ونفرت کا اظہار لفظوں میں ہو ہی جاتا ہے مگر انھوں نے اپنے پیاروں کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی انسانی کمزوروں کا بھی اسی طرح ذکر کر دیا ہے جس طرح ان کی خوبیوں کا کیا ہے، شگفتہ، شائستہ اور بلیغ انداز اظہار انہیں بہت سے مصنفین سے ممتاز کر دیتا ہے، برصغیر کے دیگر خطوں کے ساتھ ساتھ بھارت بھر میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ اور ان کے لیے تعزیتی جلسے ان کے ہر دلعزیز ہونے کی دلیل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کام کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اللہ پاک ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

**مولانا عبدالوہاب خلجی (سابق ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند)**

## بھٹی صاحب نے کوئی معمولی خدمات سرانجام نہیں دیں

● جناب اسحاق بھٹی بلا شبہ اس دور کے بہت بڑے مورخ تھے اور آپ کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں بڑی بڑی شخصیات جن میں علمائے دین اور دوسری بڑی شخصیات شامل ہیں کی بائیوگرافی بھی ہے اور حالیہ یعنی ماضی قریب کی تاریخ بھی سمٹ کر ان کتابوں میں آ گئی ہے اور یہ کوئی معمولی خدمت نہیں ہے جو انھوں نے انجام دی۔ بہت سی نامور شخصیات کی زندگی کا، ان کی کنٹری بیوشن کا، ان کے کام کا احاطہ کرنا اور ان کے بارے میں موجودہ اور آنے والی نسلوں کو آگاہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جتنا کام انھوں نے اس حوالے سے کیا ہے وہ اداروں کے کرنے کا تھا، بلکہ بہت بڑے بڑے اداروں کا کام انھوں نے اکیلے تن تنہا انجام دیا ہے۔ اگرچہ وہ بڑے اداروں میں کام کرتے رہے ہیں ادارہ ثقافت

اسلامیہ میں، اس کی بھی تربیت انہیں حاصل تھی اور ویسے بھی ان کو جو تاریخی اور ادبی ذوق تھا ان دونوں (تربیت اور ذوق) کو کام میں لاکر انھوں نے یہ وقیع اور قابل قدر کتابیں لکھیں ہیں۔ جن کی زبان و بیان بھی قابل قدر ہے اور جن کی تاریخ بیان کی گئی ہے اس کے لیے بھی ان کے لیے ایک احساس سپاس وتشکر ہم سب کے اندر ہونا چاہیے اور اس میں انھوں نے کسی خاص جماعت کی یا کسی (خاص Sect) کی بات نہیں کہ انھوں نے صرف انہیں کا احاطہ کیا ہو۔ عمومی طور پر انھوں نے جو کام کیا وہ خاص طور پر اس عصر کی یعنی اس حالیہ دور کے زمانوں کی شخصیات کا جو مفصل تعارف انھوں نے کردیا اس حوالے سے بعض اوقات تو انھوں نے کھل کر تنقیدی حوالوں سے بھی اس شخصیت کا ذکر کیا ہے مگر تنقیص ان کا مقصد نہیں تھا انھوں نے انسانی حوالے سے ان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے رکھی انسان میں خامیاں بھی ہوتی ہیں بڑی سے بڑی شخصیت میں بھی کوئی خامی ہوسکتی ہے، یہ ان کے انصاف اور کمال فن کی دلیل ہے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

**سینٹر پروفیسر ساجد میر (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان)**

## وہ تنہا ایک جماعت اور ایک انجمن تھے

● مولانا محمد اسحاق بھٹی کی رحلت سے ہمارے دل غمزدہ ہیں، اللہ تبارک وتعالی کے فیصلے پر راضی رہتے ہوئے ہم اپنے عظیم بزرگ کی مغفرت کے لیے اللہ کے حضور دست بدعا ہیں۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے جو کام کیا اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ کوئی کام کرنا چاہے تو اس کے راستے کی مشکلات اللہ تعالی خود ہی ختم کردیتے ہیں، پچاس ہزار سے زائد صفحات لکھ جانا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ انھوں نے صرف کسی ایک اور خاص سمت میں ہی کام نہیں کیا بلکہ قرآن، حدیث، فقہ، اخلاقیات وسماجیات اور دیگر موضوعات پر بھی اپنے رشحات علم وفکر سے پیاسوں کی پیاس بجھائی، وہ تنہا اپنی ذات میں ایک انجمن اور جماعت تھے، اللہ تعالی ان کی آخرت کی منزلیں آسان کردے۔ آمین

**ڈاکٹر حافظ عبدالکریم (ناظم اعلی مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان)**

## مولانا محمد اسحاق بھٹی.....ایک کتابی بزرگ

● مولانا محمد اسحاق بھٹی کی سادگی، تواضع اور دھیما پن ان کی شخصیت کو چار چاند لگا دیتا تھا، ہمارے لیے یہی اعزاز بہت تھا کہ وہ ہماری جماعت کے ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے، انھوں نے جو تصنیفی، تالیفی اور علمی کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا علم بے کراں، قلم رواں اور اسلوب ناصحانہ تھا۔ تمام مسالک ومشارب کے بزرگوں کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کا قلم کبھی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوتا تھا، معتدل اور شگفتہ، ٹھوس علمی وتاریخی مضامین انھوں نے یوں لکھے کہ ہر کس وناکس کے دل میں اتر گئے۔ وہ تاریخ کی خارزار وادی میں اترے اور مردانہ وار آگے بڑھتے گئے، ان کے رشحات فکر نوجوان نسل کے لیے راہنما ہیں۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور جنتوں میں ان کا بلند مقام بنائے۔ آمین

**مولانا محمد نعیم بٹ (سینئر نائب ناظم اعلی مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان)**

## بھٹی صاحب جیسے لوگ کسی قوم کا اثاثہ اور فخر ہوتے ہیں

مولانا محمد اسحاق بھٹی کی شخصیت پر کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ عظیم انسان تھے، ان جیسے لوگ کسی قوم کا اثاثہ اور فخر ہوتے ہیں۔ اے کاش کہ ہم بھی ان کی اسی طرح عزت وتوقیر کرسکیں جس طرح انھوں نے اپنی زندگی کی ۹۰ بہاروں میں اپنے اکابرین واسلاف کی فرمائی۔ مولانا اسحاق بھٹی دائم متبسم، عظیم مفکر، خوبصورت خطیب، مترجم ومفسر تھے، انھوں نے جماعت کی بڑی شخصیات پر لکھتے ہوئے فکر وفن کے دریا بہائے، ان کی شبنمی یادیں آج بھی ہماری آنکھوں میں شبنم بن کر چمکتی ہیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

**پروفیسر حافظ عبدالستار حامد (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پنجاب)**

## مولانا محمد اسحاق بھٹی ایک عظیم انسان تھے

● مولانا محمد اسحاق بھٹی برصغیر کے علماء میں سے ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، انھوں نے اپنی ۹۰ سالہ زندگی میں جو مبارک کام کیا وہ کسی ایک شخصیت کے بس کی بات نہیں لیکن مولانا پر اللہ کا فضل واحسان ہوا کہ انھوں نے دین اور دین کے داعیوں کی وہ خدمت کی کہ رہتی دنیا تک مثال بن گئے، ہمارا ان سے عقیدت ومحبت کا تعلق تھا۔ ان کی کتب کے قاری تھے اور ہیں، ان کی وساطت سے ہمیں برصغیر کی نامور شخصیات سے تعارف ہوا، وہ سادہ مزاج اور خوش گفتار انسان تھے۔ بیرون ملک ہونے کی وجہ سے ان کے جنازے میں شریک نہ ہونے کا قلق رہے گا۔ میں مولانا بھٹی صاحب کے خانوادے اور پوری جماعت سے ان کی وفات پر اظہار تعزیت کرتا ہوں۔

**مولانا میاں محمود عباس (ناظم اعلی مرکزی جمعیت اہل حدیث پنجاب)**

## میں نے اس شخصیت سے بہت کچھ سیکھا

● انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بھٹی صاحب کے انتقال پر شدید صدمہ ہوا۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین) میں نے اس شخصیت سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کا قلم بڑا شگفتہ تھا۔ طرز تحریر نہایت آسان تھا، تحریر پڑھ کر مزہ آجاتا، ان کا حافظہ اتنا شاندار تھا کہ تعجب

ہوتا تھا۔ اللہ تعالی جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

مولانا عبدالمالک مجاہد (چیئرمین دارالسلام)

## مولانا بھٹی جماعت کے محسن اور تاریخ اہل حدیث کے حافظ تھے

● مولانا محمد اسحاق بھٹی جماعت کے عظیم محسنین میں سے تھے، آپ تاریخ اہل حدیث کے حافظ تھے۔ اکابرین کی حیات کے کئی گوشے انہوں نے عوام الناس کے سامنے رکھے۔ ویسے تو وہ ہر ایک سے ہی احترام کے رشتے میں پرویے ہوئے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ان سے ایک خاص رشتہ تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں میرے جماعتی اکابرین کے ساتھ ساتھ میرے خاندانی اکابرین کا بھی ذکر کیا ہے، اس پر میں ہمیشہ ان کا ممنون رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی جیسی شخصیت واقعی صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور ہمیں ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین

حافظ عبدالحلیم یزدانی۔ جھنگ

## مولانا محمد اسحاق بھٹی نابغۂ روزگار شخصیت تھے

● مولانا محمد اسحاق بھٹی ایک نابغہ روزگار اور عبقری شخصیت تھے۔ سیلف میڈ انسان نے اپنی محنت سے وہ نام کمایا کہ آج بڑے بڑے لوگ شملہ اونچا کر کے ان کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔ مولانا بھٹی کے ہمارے ساتھ اور ہمارے بزرگوں کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے، جامعہ علوم اثریہ جہلم میں کئی بار تشریف لا کر انہوں نے جامعہ کی عزت میں اضافہ کیا۔ ہمارے یہاں ایک پروگرام میں انہوں نے مقالہ پڑھا آج تک لوگ ان کے سادہ اور دل نشیں انداز گفتگو کو یاد کر رہے ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی آخرت کی منزلیں آسان کر دے اور انہوں نے جو محنت کی ہے اس کا بہترین بدلہ جنت کی صورت میں عطا فرمائے۔ آمین

مولانا حافظ عبدالحمید عامر (جہلم)

## اللہ اور اس کے بندوں کا ولی.....مولانا محمد اسحاق بھٹی

● مولانا محمد اسحاق بھٹی کی وفات نے جماعت میں ایک بہت بڑا علمی خلاء پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اللہ کے فیصلے کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ قانون قدرت ہے کہ جس نے دنیا میں آنا ہے اسے بہر حال ایک دن اس دنیا سے جانا بھی ہے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی کی حسنات کا تذکرہ تادیر ہوتا رہے گا، ان کی کتب انہیں لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی کتب کے ذریعے ہماری جماعتی تاریخ کے بہت سی شخصیات اور گوشوں کو زندگی بخش دی۔ اللہ نے ان پر ایک خاص فضل یہ بھی کیا تھا کہ وہ عقیدہ اور عامل سنت ہونے کی وجہ سے نیز قرآن کے شیدائی ہونے کی وجہ سے یقیناً اللہ کے ولیوں میں شمار ہوتے تھے تو حسن اخلاق بلند کردار اور صاحب اوصاف حمیدہ ہونے کی وجہ سے آپ اللہ کے بندوں کے بھی ولی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی جدائی میں سسک کر روتے رہے۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

مولانا محمد صادق عتیق (نائب ناظم اعلی مرکزیہ پاکستان)

## ایک خوش خصال شخصیت کا انتقال پر ملال

● ہمارے ممدوح حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ جوار رحمت میں جا سوئے۔ وہ سفید پوش انسان جس نے اپنی ذہانت کو لوگوں کے فائدے کے لیے عام کر دیا اگرچہ آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر وہ ہمارے دلوں میں موجود ہیں، ان کے حسن اخلاق ہماری نوجوان نسل کے لیے تو ہے ہی ہمارے بزرگوں کے لیے بھی نمونہ ہے۔ انھوں نے دعوت دین کا کام بھی کیا اور دعوت دین کے کام کو کرنے والوں کا نام بھی سر بلند کیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کا نام بھی بلند و بالا کر دیا۔ آج دنیا بھر میں ان کی یاد میں لوگوں کے قلوب محزون ہیں، ان گنت لوگوں نے ان کے علم سے فائدہ اٹھایا۔ تاریخ کو یاد رکھنے والا ہی نہیں نوجوان نسل کو یاد کروانے والا آج خود تاریخ بن گیا۔ اللہ کے حضور ان کے بلندی درجات کے لیے ہر لحہ دعا گو ہیں۔

پروفیسر قاری محمد سعید کلیروی (امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث سٹی)

## حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

● مولانا محمد اسحاق بھٹی کی وفات سے علمی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پورا ہونا ناممکن نہیں تو کم از کم انتہائی مشکل ضرور ہے۔ مولانا ممتاز عالم دین، صاحب طرز ادیب، شگفتہ مزاج خطیب اور علم دوست حق پسند شخصیت تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا اثاثہ تھا جو ہم سے بچھڑ گیا۔ ان کی وفات صحیح معنوں میں سمجھ آئی کہ موت العالم موت العالم کیسے ہوتی ہے۔ آپ کو اپنے دور کی بڑی بڑی علمی اور نامور شخصیات کی صحبت ہی نہیں قرب بھی حاصل تھا۔ ان شخصیات کا فیض صحبت آپ کی شخصیت پر نمایاں تھا۔ بذلہ سنجی اور خوش مزاجی آپ کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اللہ تعالی ان کو جنت میں بھی اسی طرح خوش و خرم رکھے۔ آمین

صاحبزادہ حافظ محمد عمران عریف (ناظم اعلی مرکزی جمعیت اہل حدیث سٹی گوجرانوالہ)

## آہ! ابو جی.....ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے

● ابو جی (مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب) کی وفات علمی و ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ ہمارے خاندان کے لیے بھی ایک بہت بڑا سانحہ ہے، جنھیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس لیے کہ علم اور عمر میں بڑے ہونے کی وجہ

سے ابو جی ہمارے خاندان میں ''اتحاد'' کی علامت تھے۔ خاندان کے تمام بچے آپ کو ''بڑے ابو جی'' کہہ کر پکارتے۔ اللہ تعالی نے ابو جی کو یہ خاص وصف عطا کیا تھا کہ آپ ہر شخص سے اس کی ذہنی سطح پر آ کر گفتگو کرتے، اسی وجہ سے خاندان کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ ابو جی سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت کرتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ خاندان کے تمام افراد سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ شاعر کی زبان میں ہم صرف یہ ہی کہہ سکتے ہیں:

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

**حافظ محمد حسان سعید (بھتیجا مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ)**

● ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا محمد اسحاق بھٹی وہ دیدہ ور مؤرخ و مؤلف تھے جس کی زیارت کے لیے علمی دنیا کی آنکھیں ترستی ہیں۔ کم از کم پچاس سال قلم چلا کر پچاس ہزار صفحات لکھ کر دنیائے کتاب کی تاریخ میں ایک نام پیدا کیا۔ اللہ تعالی سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمیں ان کی تحریروں کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

**حکیم محمد اسماعیل (سرپرست اعلی محمدیہ قرآن سوسائٹی)**

● وہ علم کا پیکر، زہد وتقوی کا مجسمہ، سادگی و بذلہ سنجی کا نمونہ، عجز وانکساری میں ڈھلا ہوا وجود مسعود، یہ تھے مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ۔ جنھوں نے نے تاریخ کی حفاظت کی اور آج خود تاریخ بن گئے۔ احساس شناس قومیں اپنے اسلاف کو قومی ورثہ سمجھ کر ان کی باقیات صالحات کی حفاظت کرتی ہیں۔ آیئے دعا کریں کہ ہم بھی اپنے اس بقیۃ السلف جواب نمونۃ الخلف بن چکے ہیں کی باقیات کی حفاظت کر سکیں۔ آمین

**حافظ عبد الشکور شیخوپوری (مصنف کتب کثیرہ)**

## نامور مؤرخ مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

● اسلامی دنیا کے نامور اسکالر، اردو تذکرہ نگاری وخاکہ نویسی میں عالمی شہرت کے حامل ممتاز عالم دین، کہنہ مشق مصنف، صاحب طرز ادیب، معروف علمی وتحقیقی رسالہ ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے سابق ایڈیٹر اور مؤرخ اہل حدیث علامہ محمد اسحاق بھٹی کی وفات پر جمعیت اہل حدیث مئو کے جنرل سکریٹری مولوی سرفراز احمد فیضی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ علامہ محمد اسحاق بھٹی حقیقی معنوں میں کتاب وسنت کے شیدائی، عظیم مؤحد، دیدہ ور مؤرخ، علم وتحقیق کی راہوں سے آشنا محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر جماعت اہل حدیث کے اہم ستون تھے، ان کے سانحۂ وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، قحط الرجال کے اس دور میں موصوف کی ذات گرامی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، ان کی وفات سے برصغیر کی جماعت اہل حدیث ایک عہد ساز شخصیت اور جوہر گراں مایہ سے محروم ہوگئی، نئی نسل کو ان جیسی مثالی شخصیت کی سیرت حسنہ اور خدمات علمیہ سے درس وبصیرت حاصل کرنا چاہئے، اللہ رب العزت نے انہیں قوت حافظہ کی غیر معمولی صلاحیت ونعمت سے نوازا، ان کی معلومات کا دائرہ نہایت وسیع تھا، بھٹی صاحب کی اب تک کی تحریری مساعی پچاس ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں، مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان اور اس کے ترجمان ''الاعتصام'' سے ۳۲ رسال تک وابستہ رہ کر مسلک اہل حدیث کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا، ''ادارہ ثقافت اسلامیہ'' اور اس کے آرگن ''المعارف'' سے وابستہ ہوکر خالص تحقیقی نہج پر تصنیفی کام کیا، بھٹی صاحب کو قدرت نے تاریخ وتذکرہ اور سوانح وسیرت کا ایک خصوصی ذوق اور اختصاصی مزاج عطا کیا تھا، وہ نصف صدی سے زائد مدت تک مستقل اور مسلسل تہذیبی، علمی، دینی اور تاریخی میراث کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے، ان کے قلم سے تذکرہ وتراجم رجال کا ڈھیر لگ جانے کے باعث بعض اصحاب علم وقلم انہیں دور حاضر کا ''امام ذہبی'' کہتے ہیں جو صحیح معلوم ہوتا ہے، فقہائے ہند (۱۰ رجلدوں پر مشتمل) برصغیر میں علم فقہ، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، برصغیر میں اہل حدیث کی آمد، برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات، برصغیر میں اہل حدیث کی تدریسی خدمات، برصغیر میں اہل حدیث کی تنظیمی سرگذشت، برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن، نقوش عظمت رفتہ، بزم ارجمنداں، کاروان سلف، قافلۂ حدیث، دبستان حدیث، گلستان حدیث، بوستان حدیث، چمنستان حدیث، ہفت اقلیم، اسلام کی بیٹیاں، محفل خردمنداں، چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں، ترجمہ وحواشی رالفہرست (ابن ندیم)، سیرت قاضی محمد سلیمان منصور پوری، تذکرہ ردپڑی علماء اہل حدیث، گزرگئی گذران (خودنوشت سوانح) سمیت تقریباً چالیس اہم کتابیں تصنیف کیں، ان میں فقہائے ہند (۱۰ رجلدوں میں) اور برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن، تو انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے شہر کے عظیم ترین اشاعتی ادارہ مکتبہ الفہیم مئو کو دس سے زائد کتابوں کی اشاعت کا شرف اور اعزاز حاصل ہے، نئی نسل کو چاہئے کہ ان کتابوں کا مطالعہ کریں اور اسلاف کے تابندہ نقوش کو عملی زندگی میں پیش نظر رکھیں۔ اللہ ان کی لغزشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور ملت وجماعت کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین

**سرفراز فیضی (جنرل سیکریٹری جمعیت اہل حدیث مئوناتھ بھنجن، یوپی)**

☆☆☆

# مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی یاد میں (۱۹۲۵۔۲۰۱۵ء)

مصلح نوشہروی (۲۷/۱۲/۲۰۱۵ء)

بزمِ ہستی میں ہے نا ممکن دوامِ زندگی
موت کا پیغام حق ہیں صبح و شامِ زندگی

بے وفائی کی علامت ہے جہانِ رنگ و بو
اس سے واقف قریہ قریہ اس کا شہرہ کو بہ کو

ہے حقیقت ایسی، جو دنیا سے پوشیدہ نہیں
کون اس کی تلخی حالت سے رنجیدہ نہیں

کس کا مسکن ہے ہمیشہ یہ جہانِ بے ثبات
بے محابہ ہے فنا کی زد پہ ہردم کائنات

کوئی مستثنیٰ نہیں قانونِ عالم گیر سے
کون بچ پایا جہاں میں موت کی تدبیر سے

کوئی گنجائش نہیں ہے کام کی تکمیل میں
کوئی مہلت غیر ممکن حکم کی تعمیل میں

کون کہہ سکتا ہے اس قانوں میں یکسانی نہیں
ہے یہی قانون جس میں کوئی من مانی نہیں

اس جہاں میں ہر کسی کا موت ہی انجام ہے
یہ سراپا زندگی ہی موت کا پیغام ہے

ایک پل میں ختم ہو جائیں گے سب باغ و بہار
اپنے اپنے کارنامے ہی رہیں گے یادگار

☆☆☆

زمرۂ علم و عمل کو ''زندہ تابندہ'' کیا
جو نہیں معروف تھا اس کو بھی پایندہ کیا

سر زمینِ ہند میں تاریخِ اسلامی کا باب
''آمدِ اسلام'' سے وہ بن گیا روشن کتاب

آمدِ اہل حدیثاں کے نقوشِ اولیں
کارہائے زندگی ، وابستۂ دنیا و دیں

ان کی تحریروں سے روشن نامِ قرآن و حدیث
ان سے متعارف ہوے خدامِ قرآن و حدیث

سیرتِ اصحابِ شیخ کل ہے ان کی شاہ کار
قافلہ اور کارواں اس فن میں ہوگی یادگار

ہفت اقلیم و دبستان و چمن، گل اور سلف
تھا فقط ترتیبِ آثارِ سلف ان کا ہدف

ان کی تحریروں سے ہے اندازۂ شانِ بلند
محفل دانش سجی ہے اور بزمِ ارجمند

ادبیاتِ سلف ہے تحفۂ برصغیر
یعنی ہند و پاک و بنگلہ دیش میں حق کی نظیر

ایک دیگر کے شناسا ہوگئے علمائے ہند
رشک! اردوئے معلّی میں جو ہے ''فقہائے ہند''

غزنوی، لکھوی، قصوری، صوفی، سلفی ، دہلوی
فضلِ حق ، سلمان و احمدوین اور امرتسری

گوندلہ، گجرانوالہ، مالواڈہ بھوجیان
اور وزیرآباد تحریروں میں ہیں شایانِ شان

وہ حنیف باہنر ندوی کے تو ہم راز تھے
اور خلیفہ، جعفری، جعفر کے بھی دم ساز تھے

دلّی و لاہور و امرتسر نہیں گو دور ہیں
پر رحیم آباد و آرہ اور مبارک پور ہیں

لکھ دیے ہیں اہلِ صادق پور کے وہ واقعات
جیسے کہ حاضر وہاں ہوں وہ بہ وقتِ واردات

☆☆☆

دفترِ اہلِ حدیثاں میں ہوئی تھی پرورش
ہوگئی تھی ان کی شخصیت وہیں سے پرکشش

غزنوی سلفی کی وہ دورِ امارت میں رہے
اور مجلات و جرائد کی ادارت میں رہے

تھا صحافت میں ہمیشہ سے بہت اعلیٰ مقام
جس کا شاہد ''المعارف''، جس کا در ''الاعتصام''

ان کی تحریروں کا ''اسلامی معارف'' میں وجود
اہلِ حق کے واسطے ہے لائقِ بسط و کشود
کس قدر ماحولِ حق تھا ان کے ذہن سے آشنا
ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی تھے ان سے آشنا
کتنی دیرینہ کتابوں کے کیے ہیں ترجے
جن میں علم وفضل وحکمت کے ہیں سارے ہمہمے
وہ کبھی پیچھے نہیں تھے علم کی توفیق میں
دسترس حاصل تھا ان کو شعبۂ تحقیق میں
ان کی تحریروں سے ان کے ذوقِ عالی کا ظہور
ہے نمایاں طرز ان کی اور عیاں ان کا شعور
ان کی تحریروں کا مقصد ملک و ملت کا وقار
بھولتے ہرگز نہیں ہیں اپنے مسلک کا شعار
کچھ نہیں تعقید ہوتی ہے کسی تعبیر میں
کھینچتے ہیں ایسا نقشہ حیطۂ تحریر میں
وہ ہنسا دیتے ہیں اپنے با اثر انداز سے
اور رلا دیتے بھی ہیں وہ اپنے سوز و ساز سے
ان کی مجلس میں طوالت کا نہ ہوتا تھا خیال
رولتے تاریخ کے موتی، یہ طرزِ بے مثال
آ ہی جاتی اس سے قلب و روح میں بالیدگی
تھی ظرافت میں بھی ان کی، اس طرح سنجیدگی
ان کی صحبت اور مجلس کی لطافت یاد ہے
سوز بھی آزاد ہے اور ساز بھی آزاد ہے
ذکرِ اسلافِ گرامی تھا حسین انداز میں
منہمک ہو جائے مجلس اس کے سوز و ساز میں
ان کی طرزِ گفتگو بالکل نہ دل آزار تھی
غیرتِ مسلک مگر ہر وقت شعلہ بار تھی

☆☆☆

صبر و شکر و زہد و تقوی سادگی ان کا شعار
ان میں تھا موجود اخلاقِ حمیدہ کا وقار
ان کی خوبی ہر شناسا سے وفا کیشی رہی
ان کی دولت بس جہاں میں ان کی درویشی رہی
وجہِ شہرت ان کی اپنی خامہ فرسائی ہوئی
یوں ''فقیر بے نوا'' کی بھی پذیرائی ہوئی
حضرتِ اسحاق جو مجموعۂ اوصاف تھے
کیوں نہ ہو ایسا کہ وہ گرویدۂ اسلاف تھے

☆☆☆

سیرت و خاکہ نگاری کا حکیمانہ شعور
اس کا شہرہ قریہ قریہ اس کا شہرہ دور دور
در حقیقت تھا وہ اس سیرت نگاری کا ستوں
کر سکی اس کی حفاظت بھی نہ یہ دنیائے دوں
چل بسا خاکہ نگاری کا وہی دانائے راز
اپنے فن کا عصرِ حاضر میں سراپا تھا مجاز
ان کو دنیا سے مبارکباد کے تحفے ملے
ان کو اپنے فن میں یکتائی کے بھی طمغے ملے
یاد اسلافِ گرامی کی وہ رعنائی نہیں
حضرتِ بھٹی کی جو اب بزم آرائی نہیں

☆☆☆

خود فراموشی کے اہل علم تھے کتنے شکار
طاقِ نسیاں سے نکل کر ہوگئے ہیں نام دار
تذکروں میں دورِ گم نامی بھی ہوجاتا تھا ماند
حافظہ ان کا لگا دیتا تھا اس پر چار چاند
کتنی پرتاثیر تھی لوح و قلم کی بارگاہ
کر دیا اس نے فقیروں کو بھی مثل بادشاہ
اب ہمیں اسلاف کی تاریخ بتلائے گا کون؟
اپنی اس تاریخ کی گتھی کو سلجھائے گا کون؟
تبصرہ میں کیا کروں اس مرد کے احساس پر
اپنے دل کو رکھ دیا ہے صفحۂ قرطاس پر
زندگی بخشی ہزاروں علم کے آفاق کو
موت نے چھوڑا نہیں پر حضرتِ اسحاق کو
''ہیں اسی قانونِ عالم گیر کے یہ سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گل چیں کا دنیا سے سفر''

☆☆☆

# میں بارِ غم سے درِ حق پر سرخمیدہ ہوں

بہ موقع وفات حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی و مولانا عبداللہ مدنی رحمہما اللہ

مولانا عتیق اثر ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ دریا آباد)

وہی فضا تھی وہی ماہ و سال کے ایام
وہی طلوعِ سحر تھی وہی شبِ آلام
مگر یہ کیا کہ اُدھر پاک کا ستارہ☆ گرا
ادھر ہمالیہ کی گود سے گیا مہِ تام☆
فضا بدل گئی تارے بکھر گئے سارے
کہ اشکِ سرخ سے سب لالہ رخ ہیں نظارے
وہ بوستانِ حدیثِ☆ رسول کی خوشبو
وہ باغِ حکمت و دانائی کا شہِ گل رو
وہ کاروانِ حدیث رسول کا شاہد
وہ جس نے نشر کی خوشبوئے علم ہر ہر سو
وہ انجمن میں سراپا پیامِ آگاہی
وہ رازدانِ قیام و سجودِ شب گاہی
اسی کے ساتھ گیا نورِ وحدت و توحید☆
جو شعر و نثر کی تخلیق میں تھا فردِ وحید
تلاش کرتی ہے محفل کہاں ہے عبداللہ
چراغِ بزمِ ہنرروقِ وشنید و دید
ہنروران جماعت کدھر کی راہ چلے
کہ کام ادھورے ہیں آخر جدھر نگاہ چلے
ذرا ٹھہرتے بہت کام رہ گئے ہوں گے
ابھی تو خالی کئی جام رہ گئے ہوں گے
سنبھالتے نئی راہوں کے پاپیادوں کو
کئی مقام پہ ناکام رہ گئے ہوں گے
نئی اجالے نئی راہ سے نہ بھٹکائیں
انہیں سنبھلنے سے روکیں کہیں نہ اٹکائیں

میں سوچتا ہوں نئی روشنی میں دم کیا ہے
جو نور چھوڑ کے رخصت ہوئے وہ کم کیا ہے
مرے کریم انہیں تو غریقِ رحمت کر
غموں سے چھوٹ گئے مستقل تو غم کیا ہے
اثر پذیریٔ ماحول سے کبیدہ ہوں
میں بارِ غم سے درِحق پہ سرخمیدہ ہوں
دریدہ دامنی لازم ہے پھر سیوں کیسے
اگر میں غم نہ اٹھاؤں تو پھر جیوں کیسے
سنبھل کے راہ گزاری ہماری قسمت ہے
شرابِ کیف میسر، مگر پیوں کیسے
اُدھار رکھتے ہیں ایک روز آنے والا ہے
سرور کیف کا عالم بدلنے والا ہے

☆☆☆

☆مراد ہیں ''مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔
☆مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری رحمہ اللہ۔
☆مولانا بھٹی کے سلسلۂ تصانیف کی ایک کتاب کا نام ہے۔
☆مولانا مدنی کی زیر ادارت نکلنے والا رسالہ ''نورِ توحید'' مراد ہے۔

☆☆☆

**قارئین ''ترجمانِ جدید'' سے**

محترم قارئین گزشتہ کئی ماہ سے ترجمان جدید شائع نہیں ہوسکا، ادارہ انتظار کے لیے معذرت خواہ ہے۔ زیر نظر شمارہ مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ کی زندگی پر خاص نمبر ہے۔ امید کہ قارئین پسند فرمائیں گے۔

(ادارہ)

# ''جمعیت اہل حدیث ہند'' آل انڈیا مشاورتی میٹنگ کی رپورٹ

## بمقام ہوٹل ریورویو ابوالفضل نئی دہلی

عبدالمبین ندوی

مورخہ ۳۱؍جولائی شام ۵ بجے ریورویو ہوٹل کے ہال میں شیخ صلاح الدین مقبول احمد کی صدارت میں منعقد جلسہ کا آغاز حافظ شکیل احمد میرٹھی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، جب کہ نظامت کے فرائض جناب کوثر معبودی نے انجام دیے۔ اس موقع پر مولانا ارشد مختار محمدی، شیخ عبدالمعید مدنی، مولانا رضاء اللہ عبدالکریم مدنی، شیخ عبدالوہاب خلجی، حکیم اجمل خاں، حافظ محمد یوسف، حافظ شکیل احمد میرٹھی، ضمیر الحق منڈل (پٹنہ)، غلام نبی پرے (سری نگر) اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔

صدر نگراں بورڈ کی دعوت پر ملک کے مختلف گوشے کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک کے علماء وذمہ داران میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف لائے، صدر محترم نے مہمانوں کا استقبال کیا، اس موقع پر اپنے مختصر خطاب میں فرمایا: آپ یہاں کسی ذاتی کام سے نہیں آئے بلکہ جماعت کی غرض سے آئے ہیں تمام مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے دل جذبہ شکر سے لبریز ہے۔ جمعیت ہمارے اسلاف کی تنظیم ہے جس کا سات صوبوں میں شورائی بنیاد پر انتخاب ہو چکا ہے، اس کو مزید فعال اور متحرک بنانے کے لیے تقوی و پرہیز گاری کی بنیاد پر کام کریں، مختلف صوبوں کے صدور سے گزارش ہے کہ آپ اپنے پاؤں پر اٹھ کھڑے ہوں، اللہ ہم کو توفیق دے کہ ہم اس کو پھلتا پھولتا دیکھ سکیں مزید کہا کہ میں بھی ایک انسان ہوں مجھ سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں اور ہوں گی تو اس حالت میں آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ ہمیں صحیح راستے کی طرف رہنمائی کریں اور تنظیم کو کارآمد بنانے میں معاون ہوں۔

شیخ عبدالمعید مدنی: گزشتہ کارکردگی کا جائزہ لینے سے قبل شیخ عبدالمعید مدنی کو دعوت خطاب دیا گیا، موصوف نے اپنے مختصر سے خطاب میں فرمایا کہ جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں تنظیم قائم کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے، یہ تنظیم نہ کوئی خلافت راشدہ ہے نہ ہی فرضیت کے درجے میں ہے، بلکہ ان کی حیثیت مباح کی ہے، تنظیم میں اخلاص وصالحیت، بصیرت، خیر کا جذبہ، عمل ومحنت ہونا چاہیے، یہاں اکٹھا ہونا خوش آئند نہیں بلکہ ایک مجبوری وضرورت ہے، تنظیم کو مفادات وذات برادری سے بلند ہونا چاہیے، آج ہمارے یہاں سیکولر بنیاد پر انتخاب ہوتا ہے، جس کو چاہیں لے آئیں، یہ اسلامی انتخاب وتعلیم نہیں ہے۔ شیخ نے مزید کہا کہ اسلامی تنظیم کے جو خدوخال ہوتے ہیں اور ان کے ممبران کے جو صفات ہوتے ہیں ان سے متصف ہونے کی ضرورت ہے، آج اگر جذبہ ہے تربیت کا تو اس کے لیے نظم وضبط و اخلاص واجب کے درجے میں ہے، ہمارا یہاں اکٹھا ہونا کسی ردعمل یا اپوزیشن کے تحت نہیں بلکہ سلفی منہج کو فروغ دینے کے لیے اکٹھا ہوئے ہیں، اگر یہ جذبہ نہیں ہے تو تنظیم کو کھڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہمارا جو کچھ کئی سالوں سے تاراج ہو چکا ہے اس کو ہم بحال کر سکیں۔

مولانا نے کہا کہ ہمیں ایسے افراد کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے جو اصل میں اسلامی تعلیم وتبلیغ کو لوگوں تک پہنچائیں کیوں کہ اسی سے ملک میں امن وامان پیدا ہوگا۔ آپ کے خطاب کے بعد گزشتہ کارکردگی کے ایجنڈوں پر گفتگو ہوئی۔

### ۱۔ گزشتہ کارکردگی کا جائزہ:

گزشتہ کارکردگی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے صدر نگراں بورڈ شیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی نے کہا کہ: نئی تنظیم قائم کرنا آسان کام نہیں ہوتا ہے، ایک تنظیم کی موجودگی میں دوسری تنظیم کھڑا کرنا آسان نہیں ہے، شیخ نے بتایا کہ آسام اور کشمیر میں پہلے ہی تنظیم بنالی گئی تھی اس کے بعد اور مختلف صوبوں میں تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں جو اپنے اپنے صوبوں میں جمعیت کی ماتحتی میں ریلیف اور دعوت وتبلیغ کا کام حتی المقدور انجام دے رہی ہیں۔

ریلیف کے کام بتانے یا گنانے کے لیے نہیں ہوتے ہیں لیکن بعض مواقع پر ان کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے تاکہ لوگوں کو علم ہو اور اس میں شرکت کریں۔ کشمیر میں سیلاب زدگان کے لیے ریلیف کا کام ہوا، بہار میں سیلاب زدگان وآتش زدگان کے لیے ریلیف کا انتظام کیا گیا، مظفر نگر کے فساد متاثرین کی حتی المقدور مدد کی گئی۔ آج بھی بہار آسام میں سیلاب سے متاثرہ کنبوں کو مدد کی ضرورت ہے اس لیے بغیر اپیل کیے ہوئے ذمہ داران کام شروع کر دیں ہم بھی ان شاء اللہ ہر ممکن تعاون کریں گے، موسمی مشاریع کا انتظام تقریباً ملک کے اکثر صوبوں میں کیا جاتا ہے۔

طلباء مدارس و یونیورسٹیز کا حتی الامکان تعاون کیا گیا، یونیورسٹی میں طلبہ و طالبات کے لیے سمر کورسز کا انتظام کرایا گیا جس سے کافی فائدہ ہوا۔ ہمیں اپنا منہج نہیں بھولنا چاہیے جب سلفی منہج نہیں رہے گا تبھی خارجیت جہمیت پیدا ہوگی، ہمارے عزائم یہ ہیں کہ ہم مساجد سے پورا کام لیں، وہاں دروس قائم کریں۔ یہ میڈیا کا زمانہ ہے ایک جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے سو بار جھوٹ بولا جا رہا ہے، آپ کہیں کوئی پروگرام کریں تو میڈیا کے لوگوں کو دعوت دیں بلائیں تاکہ آپ کی صحیح بات لوگوں تک پہنچے اور اس کے ذریعے آپ کی صحیح ترجمانی ہو۔

### ۲۔ موجودہ جماعتی حالت و اصلاح کے لیے اقدام:

اس سلسلے میں صدر نگراں بورڈ نے کہا ہمارے لیے سب سے زیادہ ضروری اور اہم تربیت کا پہلو ہے، ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے، اس پر حکیم اجمل خاں صاحب

نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں اپنی توفیق اور ہمت سے کرنے کی ضرورت ہے ہم نے بغیر معاوضہ کے آٹھ سال تک جماعتی خدمات انجام دیے ہیں اور جماعت کی حالت خراب نہیں ہے، ہمارا دعوتی کام دوسروں سے اچھا ہے بس ہمیں ٹارگیٹ بنا کر کام کرنے کی ضرورت ہے اور اتحاد ناممکن ہے تنقید ہوتی رہے گی آپ کام کی نوعیت بتائیں، مثال کے طور پر مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا تذکرہ کیا کہ انھوں نے خاکہ بنا کر پہلے مسجد بنائی پھر تعلیم شروع کی پھر پرچہ جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔

موجودہ جماعتی حالت کے بارے میں فرمایا کہ ہم کچھ کتابیں چھاپ لیں اور جلسہ کرلیں یہ کام نہیں ہے، ہم نے آٹھ سال جمعیت چلائی ہے اس کے پاس کوئی ٹارگٹ ہی نہیں ہے۔ جماعت کو سدھارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم تعلیم کو آگے بڑھائیں، نیز تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں لاسکتے ہیں اس کے لیے کام کریں، جس سے جماعت کو فیلڈ میں کھڑا کیا جاسکے۔

مولانا عبدالحلیم ندوی (صدر جمعیت اہل حدیث احمد آباد گجرات): نے کہا کئی سال سے میں یہاں کا صدر ہوں، میری رائے یہ ہے کہ جمعیت تمام صوبوں میں مبلغین کا تقرر کرے جو ہر صوبے میں جاکر جمعیت کے اغراض و مقاصد کو بیان کریں اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ اس سے جمعیت کی اصلاح وسدھار میں مدد ملے گی۔

شفیق احمد ہاپوڑ: نے اپنی شرکت درج کراتے ہوئے کہا کہ میں نے جمعیت کے لوگوں کو ہاپوڑ آنے کی کئی بار دعوت دی جس سے وہاں جماعت کے لوگوں کو کام کرنے کا حوصلہ ملے یہ تقاضا آج تک باقی ہے۔

ڈاکٹر عطاء اللہ (جے این یو) نے کہا کہ نوجوانوں کو بھی جمعیت سے جوڑا جائے تاکہ یہ کام کو آگے لے جاسکیں اور اس سے کام میں تیزی اور بہتری آئے گی۔

شیخ عبدالمعید مدنی نے کہا: ایک ملک گیر تنظیم چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول وضوابط تیار کیے جائیں، کوئی گائڈ لائن ہونا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی کام نہیں ہوگا موصوف نے رائے پیش کی کہ اس کے لیے مختلف شعبے قائم کیے جائیں، بروقت دو شعبے ضروری ہیں:

**(۱) شعبۂ تنظیم۔ (۲) شعبۂ دعوت و تبلیغ۔**

یہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اس کے ذمہ داران مقرر ہوں جو ملکی دورہ کریں۔

حافظ شکیل احمد میرٹھی نے کہا: شیخ عبدالمعید صاحب نے جن دو شعبوں کی تعیین کی ہے اسے فوری طور پر قائم ہونا چاہیے اور یہ رائے پیش کی کہ شعبۂ تنظیم کی ذمہ داری مولانا عبدالمعید صاحب کو دی جائے اور شعبۂ دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری مولانا رضاء اللہ عبدالکریم مدنی کو دی جائے، جس کی حاضرین نے تائید کی۔

مولانا رضاء اللہ عبدالکریم مدنی: نے اس تجویز پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں تمام عمائدین جماعت کو خوش آمدید کہتا ہوں کہ آپ حضرات یہاں تشریف لائے البتہ حافظ شکیل میرٹھی کی تجویز سے معذرت خواہ ہوں کیوں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے البتہ میں جماعت کا خادم ہوں جہاں ضرورت رہے گی وہاں حاضر رہوں گا، مولانا عبدالمعید سے درخواست ہے کہ دفتر کو زیادہ وقت دیں مجھے تعلیمی کام سے جامعہ سید نذیر حسین آنا جانا رہتا ہے اس لیے معذور ہوں۔

۱۔ مزید حاضرین سے سوال کیا کہ ہمیں جمعیت چلانا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں حاضرین نے پرزور تائید کی کہ ہمیں جمعیت کو باقی رکھنا چاہیے۔

۲۔ مزید اپیل کی کہ اپنے مضامین اور اپنے دینی پروگراموں کی خبریں ترجمان جدید کو بھیجتے رہیں تاکہ اسے فعال بنایا جاسکے۔

۳۔ تربیتی پروگرام کا انعقاد ہو جس سے عام لوگوں کو فائدہ پہونچے۔

۴۔ ملکی حالات پر نظر رکھنا چاہیے جس کی روشنی میں ہمارا موقف اور نقطۂ نظر اخبارات میں سامنے آنا چاہیے اس کے لیے ہم مدارس کے طلباء کو ٹرینڈ کریں۔

۵۔ جماعت کی جانب سے مبلغ رکھیں جس سے مختلف صوبوں میں پورا شیڈول تیار ہو اور ممبر اسازی ہو کیوں کہ تنظیمیں بغیر پلان کے نہیں چلتیں اور آفس میں مزید افراد بڑھائے جائیں۔

## جمعیت اہل حدیث ہند کے رجسٹریشن پر غور:

اس ایجنڈے پر غور کرتے ہوئے حاضرین نے جمعیت کے رجسٹریشن کی تائید کی۔

فصیح الدین حیدرآبادی: موصوف نے رجسٹریشن پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بریلویت و دیوبندیت سے نکال کر اہل حدیث بننے کا شرف بخشا، موصوف نے کہا کہ جمعیت کی رجسٹریشن کی کوئی شرعی ضرورت نہیں لیکن جس قانون کی رو سے رہ رہے ہیں اس کی روشنی میں یہاں رجسٹریشن ضروری ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی جمعیت رجسٹر کرانے اور مرکزی جمعیۃ کے ذریعہ مقدمہ کرنے اور اس کا جواب دینے کی تفصیل بتائی۔

## ۴۔ آئندہ سال کے لیے منصوبہ بندی:

اخراجات آفس کا کرایہ تنخواہ وغیرہ ماہانہ تقریبا ایک لاکھ سے اوپر ہے ہمارے بھائیوں کو اس سلسلے میں توجہ دینی چاہیے ہم نے ابھی تک کوئی چندہ نہیں کیا ان شاء اللہ رجسٹریشن کے بعد رابطہ کیا جائے گا۔

رجسٹریشن کے سلسلے میں شیخ عبدالوہاب خلجی صاحب نے بتایا کہ لوگوں کے شناختی کارڈ نہ ملنے کی وجہ سے رجسٹریشن میں تاخیر ہوئی۔

بعد نماز مغرب صدر نگراں بورڈ نے جناب مولانا ارشد مختار صاحب کو اظہار خیال کے لیے دعوت دی اور یہ بتایا کہ ہمارے ساتھی نے عملی طور پر بہت اچھا اقدام کیا ہے کہ ایک طالب علم ایک ہی کیمپس میں عالم اور سائنسداں دونوں بن سکتا ہے۔

**شیخ ارشد مختار محمدی:** موصوف نے کہا صدر محترم کا حکم ہے اس لیے کچھ بولوں گا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پورے ملک سے لوگ یہاں آئے ہیں ہم تین سال سے اکٹھا ہو رہے ہیں اور افسوس ہے کہ ہمیں اب تک جو کر لینا چاہیے تھا وہ نہیں کر پائے ہیں اور یہ مجلس بھی ایسی ہی نہ ہو، ایک مثال پیش کی کہ بھٹکل میں مولانا علی میاں ندوی کے نام سے مولانا الیاس ندوی ایک ادارہ چلا رہے ہیں ایک سال میں پچپن ادارے قائم کیے ہیں، کیا ایک سال کے اندر ہم نے کوئی ایک مکتب بھی قائم کیا ہے؟ کسی سے بات کرو تو ڈیڑھ کروڑ کا بجٹ رکھ دے گا میرے بھائیو! مدرسے بلڈنگوں سے نہیں پیڑ کے نیچے سے شروع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی نے جب نبوت کا کام رسول ﷺ کو سونپا تو کوئی چیک کا ڈرافٹ نہیں دیا بلکہ کام شروع ہوا تو قیصر و کسری قدموں میں آ گئے۔

تنظیم مدرسوں و مسجدوں سے چلتی ہے جب ائمہ مساجد کے ذریعے ڈاٹا تیار ہو جائے گا تو کام آسان ہو جائے گا اگر ہم محلّہ کے امام کو کام سونپیں تو با آسانی پورا ڈاٹا تیار ہو جائے گا۔

**حکیم اجمل خاں میوات:** نے تبلیغی جماعت کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں منظم ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو مساجد سے جوڑنا ہوگا، مزید کہا کہ تمام صوبوں کے ائمہ کی کانفرنس بلائیں اور ان سے کام لیں۔

صدر نگراں بورڈ نے صوبوں کے ذمہ داران سے ان پر عمل کرنے کی اپیل کی اور کہا کہ شیخ ارشد مختار صاحب نے جو کہا ہے اس پر عمل کریں۔

**شیخ عبدالمعید مدنی** نے کہا اس مجلس کا اہم فیصلہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم اسلامی دستور مکمل کریں، شوری قائم کریں، ممبر سازی کا کام مکمل کریں، مساجد و مدارس میں تعلیم کا نظام سٹ اپ کریں۔ اب یہ ایڈہاک نہیں رہے گا مکمل تنظیم قائم کرنا ہوگا اور ہر وہ کام کرنا ہے جس سے جماعت کو فائدہ پہنچے۔ ہمیں یہاں سے نئی شروعات کرنی ہے ہمیں سلبی و منفی پہلو پر کام نہیں کرنا ہے یہ عہد و حوصلہ کر لیجیے ابھی تک ریہرسل کا دور تھا اب مخمصہ کا دور ختم ہو چکا ہے۔

**حافظ محمد یوسف (دہلی)** نے آفس میں مزید افراد کے بڑھانے کا مشورہ دیا۔

**عبدالمعید انجینئر (رچھا بریلی)** نے کہا کہ ہمیں مرکزی جمعیت سے کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہیے، میری رائے یہ ہے کہ ہمیں صرف دینی تعلیم پر توجہ نہیں دینی چاہیے عصری علوم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے کیوں کہ ہمارے بچے مشینری اسکولوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہماری یہ تنظیم صرف تعلیم پر توجہ دے تو ہم کامیاب ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔

**مولانا محمد مقبول آکھرنی (سرپرست دفاع جمعیت اہل حدیث سری نگر)** نے کہا ہمیں اس تنظیم کو باقی رکھنی ہے، ہم نے آٹھ سال پہلے انہیں مجبوریوں و ضرورتوں کے پیش نظر دفاعی جمعیت اہل حدیث کے نام سے تنظیم رجسٹرڈ کرائی ہے۔ ہم نے یہاں کے علماء شیخ صلاح الدین مقبول، شیخ عبدالمعید مدنی، شیخ عبدالوہاب خلجی، شیخ رضاء اللہ عبدالکریم مدنی کو دعوت دی وہ تشریف لائے اور اس سے جماعت و جمعیت کو بہت فائدہ پہنچا۔

**ڈاکٹر نجیب الرحمٰن آسام:** نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اس میٹنگ میں جو فیصلہ لیا ہے اس کی مدت متعین ہونی چاہیے، جیسے رجسٹریشن کرانے کا جو فیصلہ لیا گیا ہے۔ اسے ہمیں ایک ماہ میں مکمل کر لینا چاہیے، شوری میں جو فیصلے لے جاتے ہیں اس کا بھی ٹائم فریم ہونا چاہیے اور ہر صوبہ کے صدر اور سیکریٹری کو بلا کر اس کو مکمل کریں، ہم نے آسام میں ائمہ کی تربیت کا کام ضلعی سطح پر کیا ہے جس کا نتیجہ کافی اچھا رہا۔ اگر ہم کسی کام کو کرنے کا وقت نہیں متعین کریں گے تو وہ کام ایک سال تک بڑھتا چلا جائے گا۔

**مولانا سیف اللہ کمی:** ناظم جمعیت اہل حدیث صوبہ بہار نے کہا سب سے پہلے علماء کی تربیت ہونی چاہیے، ہمارے علماء اتنے پروفیشنل ہو گئے ہیں کہ ان کو جنازہ پڑھانے کا بھی پیسہ ملنا چاہیے، یہ سب باتیں بھی تمام صوبوں کے نمائندوں کو سامنے لانی چاہیے۔

**مولانا عبدالعلیم مدنی:** صوبہ جھارکھنڈ کے امیر نے کہا کہ ہم نے انفرادی طور پر علاقہ میں بہت کام کیا ہے اور الحمدللہ چند سالوں میں کئی ایک نوجوان اہل حدیث ہوئے اگر ان کی تالیف قلب کی جائے تو کافی فائدہ ہو اور جماعت پھلتی پھولتی رہے۔ میں نے اپنی جماعت کی سستی دیکھی ہے ہمیں گفتار کا غازی بننے کے بجائے کردار کا غازی بننا چاہیے۔

**مولانا عبداللہ سلفی امیر جمعیت اہل حدیث بنگال:** نے کہا کہ مغربی بنگال پوری طرح منظم ہے کوئی بلاک، تھانہ، ضلع تنظیم سے خالی نہیں ہے۔ تنظیم کی طرف سے ایک ماہنامہ رسالہ صراط مستقیم (بنگالی) کے نام سے نکلتا ہے جسے لوگ آن لائن بھی پڑھتے ہیں۔ ہم نے اعلان کر دیا ہے کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا ہے ہم اس سے چندہ نہیں لیں گے، موصوف نے اپیل کی ہے کہ عملاً اہل حدیث بنیے۔ بنگال کی جماعتی تاریخ پر بھی مختصر روشنی ڈالی اور کہا کہ اہل حدیث کا کام تمام جمعیتوں سے افضل ہے اگر ہمیں دس دن کا وقت دیں تو ہم پچاس ہزار لوگوں کو جمع کر دیں گے۔

**حافظ عبدالحلیم:** نے کہا کہ جماعت کو سب سے پہلے مبلغین کی تقرری کی ضرورت ہے اسی سے جماعت کے کام کو آگے بڑھایا جائے گا، جب کہ تلنگانہ کے فصیح الدین صاحب نے کہا کہ سب سے پہلے جماعت کا دستور بننا چاہیے۔

**محبوب خان دہلی** نے کہا کہ جمعیت کو مساجد سے جوڑنا چاہیے، ہم پہلے سے ہی ایسا کرتے آ رہے ہیں، اور ہم نے جماعت سے کوئی چندہ نہیں لیا بلکہ غیر جماعتی لوگوں نے ہمارا تعاون کیا ہے، مگر اسٹیج کو کبھی دوسروں کے حوالے نہیں کیا۔

آخر میں حافظ شکیل احمد میرٹھی صاحب نے تمام ارکان، ذمہ داران و شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور یہ میٹنگ بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جلسے میں جو کچھ طے پایا اس کو عملی طور پر نافذ کیا جائے۔ واللہ الموفق

## وفیات:

### مولانا عبدالوہاب خلجی کو صدمہ:

**جناب عبدالحنان خلجی کا انتقال:** ۱۳ر جولائی ۲۰۱۶ء کو مولانا عبدالوہاب خلجی حفظہ اللہ کے چچازاد بھائی جناب عبدالحنان خلجی کا مالیر کوٹلہ پنجاب میں تقریباً پچاس سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف کچھ دنوں تک ایک اسکول میں مدرس رہے، اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک گنوال میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے رہے جس کی وجہ سے وہاں اہل حدیث باقی رہ گئے ورنہ خدشہ تھا کہ غیر جماعتی افراد مسجد پر قبضہ کر لیتے۔ اس کے بعد مولانا خلجی نے ان کو مالیر کوٹلہ بلالیا اور معہد ابوالوفاء کی مسجد (ثنائی) جسے مولانا نے بنوائی ہے کی دیکھ ریکھ کرنے لگے۔ موصوف خلیق، سادہ طبیعت و دینی مزاج کے انسان تھے۔ پس ماندگان میں بیوی تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ نماز جنازہ مولانا خلجی نے پڑھائی۔ اللہ رب العالمین موصوف کی مغفرت فرمائے۔ آمین

**ماسٹر اختر پرویز کا انتقال:** دوسرا صدمہ مولانا عبدالوہاب خلجی کو ٹھیک ایک ماہ بعد ان کے بہنوئی ماسٹر اختر پرویز کی مورخہ ۱۳ر اگست ۲۰۱۶ء کی وفات سے پہنچا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

موصوف اسلامیہ ہائی اسکول کے ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ شروع میں اسلامیہ ہائی اسکول پھر سیکنڈری اسکول اس کے بعد مختلف برانچ میں ٹیچر رہے، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے پنجاب سے شوریٰ کے ممبر رہے اور آل انڈیا ملی کونسل پنجاب کے بانی ممبر تھے اور مرکزی عاملہ کے بھی ممبر تھے۔ پس ماندگان میں دو بچیاں ہیں۔ اہلیہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ جنازے کی نماز وصیت کے مطابق مولانا خلجی کو پڑھانی تھی مگر موصوف کی غیر موجودگی کی وجہ سے حافظ محمد ولی نے پڑھائی۔ عمر ۷۳ر سال کی تھی۔

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

### مولانا عبدالرحیم امینی کو صدمہ

۳۱ر اگست ۲۰۱۶ء کو جماعت کے معروف عالم دین کے جواں سال بیٹے ڈاکٹر شرف الدین کا اچانک ڈینگو کی وجہ سے دہلی میں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

موصوف جامعہ اسلامیہ سنابل دہلی سے فارغ التحصیل تھے۔ بلاشبہ یہ سانحہ تمام اہل خانہ اور دیگر متعلقین کے لیے انتہائی رنج وغم کا باعث ہے۔ اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ والدین اور مرحوم کی جواں سال بیوہ اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے اور مرحوم کی خطاؤں سے درگزر فرما کر جنت الفردوس سے نوازے۔ آمین۔

### پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی کا انتقال:

۳۰ر ستمبر ۲۰۱۶ پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی کے انتقال پر صدر نگراں بورڈ جمعیت اہل حدیث ہند شیخ صلاح الدین مقبول احمد نے ایک پریس نوٹ میں گہرے رنج وغم واظہار کرتے ہوئے کہا کہ: علمی وجماعتی حلقوں کے لیے یہ خبر باعث رنج وغم ہے کہ راجدھانی دہلی کی دینی، علمی، ادبی، فکری افق پر پون صدی تک روشنی بکھیرنے اور اپنی گل افشانی گفتار سے لوگوں کو متاثر کر دینے والے پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی کا انتقال ہوگیا۔

موصوف کا تعلق خالص علمی سلفی گھرانے سے تھا، پیدائش ۹ر اگست ۱۹۳۶ء کو دہلی میں ہوئی، موسوف صدر بازار میں رہتے تھے، آپ کی والدہ ماجدہ مولانا عبدالوہاب صدری (شاگرد میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی) کی شاگرد تھیں۔ پروفیسر صاحب کی ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوئی، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج سے گریجویشن کیا اور پھر اسی کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔

موصوف فارسی زباب وادب کے ماہر، کہنہ مشق استاذ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں فارن لینگویجز کے صدر شعبہ اور کئی سرکاری کمیٹیوں کے ممبر تھے نیز مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی مجلس شوری وعاملہ کے بھی متحرک ممبران میں سے تھے۔ علم وعلماء اور مسلک سے وابستگی ہی تھی کہ جامعہ سلفیہ بنارس کے سیمیناروں میں بہت دلچسپی سے شریک ہوتے، نہایت منکسر المزاج اور نرم لب ولہجہ کے دراز قامت وخوبرو انسان تھے۔ ان کے انتقال سے علمی وادبی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کی نیکیوں کو قبول فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

### محمد ہاشم خان کو صدمہ

معروف صحافی وقلم کار جناب محمد ہاشم خان (ممبرا) کی والدہ کا بعمر ۷۰ر سال ۳۰ر ستمبر ۲۰۱۶ء کو انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ نے طویل عمر پائی صوم وصلاۃ کی پابند خوش اخلاق ونیک خاتون تھیں، انھوں اپنے بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کی۔

رب العالمین مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

### دعائے مغفرت ودعائے صحت کی اپیل:

جماعت کے نوجوان داعی مولانا سرفراز فیضی کے بڑے بھائی نثار خان کے پانچ بچوں کا بیک وقت باندرہ میں پانچ منزلہ مکان گر جانے سے انتقال ہوگیا۔ اناللہ والیہ راجعون۔

جناب نثار خان جماعت کے معروف عالم دین مولانا عبدالعلیم ماہر بستوی رحمہ اللہ کے بھتیجے اور داماد بھی تھے۔ اللہ رب العالمین صبر کی توفیق سے نوازے۔

بلاشبہ یہ صدمہ نہ صرف اہل خانہ کے لیے بلکہ ہر سننے والے کے لیے بہت ہی

المناک تھا۔ اللہ رب العالمین مرحومین کی مغفرت فرمائے اور زخمی والدہ اور بچے کو شفائے عاجل وکامل سے نوازے۔

## مولانا شفیق الرحمٰن (تلشی پور) کی اہلیہ کا انتقال

گزشتہ دنوں جماعت کے عالم دین مولانا شفیق الرحمٰن صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ ایک سلیقہ مند نیک خاتون تھیں وہ حاجی عبدالودود صاحب اونرہوا کی بیٹی اور مولانا عبدالصبور کی بہن تھیں۔ دعا ہے کہ اللہ رب العالمین مرحومہ کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس سے نوازے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

## شیخ عبیدالرحمٰن اعظمی مدنی کا انتقال

علمی و جماعتی حلقوں کے لیے یہ خبر باعث رنج وغم ہے کہ جنوب ہند معروف قدیم تعلیمی ادارہ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے ناظم اور معروف عالم دین مولانا انیس الرحمٰن اعظمی کے بھائی شیخ عبیدالرحمٰن اعظمی مدنی کا ۱/اکتوبر ۲۰۱۶ء میں بعمر ۶۵/ سال انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مولانا کا تعلق مئو کے ایک علمی خاندان سے تھا، موصوف جامعہ دارالسلام سے فراغت کے بعد مدینہ گئے، پھر مختصر مدت کے لیے مدرس ہوئے اس کے بعد ۲۰/سال تک عرب امارات میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، وہاں سے واپسی پر جامعہ دارالسلام کے مدرس، پرنسپل پھر ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔

اللہ رب العالمین موصوف کی لغزشوں سے درگزر فرما کر جنت الفردوس سے نوازے۔ آمین

## ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی کو صدمہ

قارئین کے لیے یہ خبر بے حد افسوس کے ساتھ پڑھی وسنی جائے گی کہ جماعت کے معروف عالم دین ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی (استاذ ومفتی جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں) کی اہلیہ محترمہ کا ۴/اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

موصوفہ شوگر کی مریضہ تھیں، ڈاکٹر صاحب مدینہ طیبہ سے واپس آکر جامعہ محمدیہ کو مستقل مقر عمل بنالیا۔ ۶/بچوں کی تربیت وپرورش کرکے نیک صالح خاتون کی ذمہ داری نبھائی۔ اللہ تعالی مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

☆☆☆

**اراکین جمعیت اہل حدیث ہند و ادارہ ترجمان جدید ان تمام مرحومین کے حق میں دعا گو ہیں کہ اللہ رب العالمین ان سب کی مغفرت فرماکر جنت الفردوس سے نوازے۔ آمین**

(ص:۴۱/ کا بقیہ)

شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی کے علم وفضل، علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ اور خاص کر علم حدیث اور اس کے متعلقہ علوم میں ژرف نگاہی اور حدیث نبوی ﷺ کی نصرت، حمایت، تائید اور مدافعت میں ان کی خدمات عالیہ اور تدریس میں ان کی مہارت کے بہت مداح تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ''مولانا سلفی جیسا نیک پارسا اور شریف انسان اور متبحر عالم دین نہیں دیکھا۔''

حضرت مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جن حضرات کے علم اور تقوی کے معترف ہوتے تو بڑی فیاضی کے ساتھ ان کا ذکر کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت بھٹی صاحب خود بھی بہت زیادہ مطالعہ کرتے اور اپنے واقف کار لوگوں کو امام احمد بن حنبل، امام ابن تیمیہ، امام محمد بن عبدالوہاب، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے حالات پڑھنے کی ترغیب دیتے۔

مولانا اسحاق بھٹی کریم النفس، شریف الطبع انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے پہلو میں ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے، دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ وہ بہت زیادہ خوددار بھی تھے، عفاف واستغناء کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا، طبیعت میں قناعت تھی، جاہ وریاست کے طالب نہ تھے، کریمانہ اخلاق اور ستودہ صفات کے حامل تھے، ان کے اتنے کھرے اور صاف گو ہونے کے باوجود احباب وعقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ یہ ان کے وسعت اخلاق کی بڑی دلیل تھی۔ آج ان کے غم میں سیکڑوں دل زخمی اور بہت سی آنکھیں پرنم ہیں۔ مولانا بھٹی ایک تو مطالعہ بہت کرتے تھے دوسرے خطوط کا جواب باقاعدہ دیتے تھے، راقم الحروف جب بھی ان کو کوئی کتاب بھیجتا تو دو تین دن کے بعد ہی ان کا فون آجاتا، فرماتے ''عراقی صاحب آپ کی کتاب مل گئی اور میں نے پڑھ لی ہے، بہت عمدہ اور نفیس کتاب ہے۔ اگر کوئی سقم ہوتا تو اس کی نشاندہی کرتے تھے۔''

فرمانے لگے کہ ''عراقی صاحب! میں ٹھوس اور قیمتی مطالعہ کا ذوق استاذ محترم (مولانا عطاء اللہ حنیف رحمۃ اللہ علیہ) ہی سے پایا ہے۔ رات سونے سے قبل جب تک مطالعہ نہ کروں نیند نہیں آتی۔

اپنی تحریری نگارشات کے بارے میں بھٹی صاحب فرماتے ہیں کہ ''میرے قلم کی تربیت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا سید داؤد غزنوی اور زیادہ تر مولانا عطاء اللہ حنیف ندوی کی نگرانی میں ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ان اصحاب فضل سے فیض یاب ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔

اب بھٹی صاحب ہم سے رخصت ہوکر اللہ کے حضور پہنچ چکے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ رب العالمین جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے۔ آمین

Date of Publishing 10/11/2016 Date of Posting 12-13/11/2016

Total Page:88

# Tarjaman-e-Jadeed

*Fortnightly*

P.R. NO. DL - (S) 01/3467/2014-16
R.N.I. No. DELURDU/2013/52658

1st June to 31 November 2016 Rs. 100.00
Vol.3 Issue:19/24
Vol.4 Issue:1-6

E-57, 1st Floor, (Near Scholar School) Abul Fazal Enc. Part-1, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25

علمی اور تاریخی دو روزہ عالمی

# سیمینار

بعنوان

## ”حضرت میاں سیّد محمد نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ - حیات وخدمات“

| صدر سیمنار | سرپرست سیمنار |
| --- | --- |
| فضیلۃ الشیخ عبدالمعید مدنی حفظہ اللہ | فضیلۃ الشیخ صلاح الدین مقبول احمد مدنی حفظہ اللہ<br>صدر جمعیت اہل حدیث ہند |

| بوقت | بمقام | بتاریخ |
| --- | --- | --- |
| 4:30 بجے شام<br>تا<br>10:00 بجے رات<br>صبح 9 بجے تا نماز عشاء | 4/ مارچ بروز ہفتہ<br>بمقام: ایوانِ غالب<br>ماتا سندری روڈ، نئی دہلی-2<br>5/ مارچ بروز اتوار<br>مسجد مکتب پھاٹک حبش خاں (کھاری باؤلی)، دہلی-6 | ۵-۶/ جمادی الاخری ۱۴۳۸ھ<br>4-5/ مارچ 2017ء<br>بروز ہفتہ - اتوار |

جس میں ملک کی معزز شخصیات، موقر اہل علم اور فاضل مقالہ نگاران شرکت کریں گے ان شاء اللہ، نیز مختلف ممالک کے اہل علم سیمینار کے لیے مختلف زبانوں میں مقالات ارسال کریں گے۔ اس سیمینار کے ذریعے حضرت میاں صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی علمی، دعوتی، تدریسی، تصنیفی اور مجاہدانہ خدمات کے متعلق تفصیلی تذکرہ ہوگا۔ کوشش یہ ہے کہ حضرت میاں صاحب کی خدمات پر ایک معتبر ومفصل اور تاریخی دستاویز تیار ہو جائے۔ جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکے۔ واللہ الموفق

کنوینر: مولانا راشد حسن سلفی مبارکپوری (M) : 9718764228
مدیر انتظامی: حافظ شکیل احمد میرٹھی (M) : 9910889357
معاون: مولانا عبدالقدیر سلفی (M) : 9310644502
معاون: مہتاب خاں (M) : 9891022044

جملہ اراکین جمعیت اہل حدیث صوبہ دہلی

منجانب جمعیت اہل حدیث صوبہ دہلی
JAMIAT AHLE HADEES DELHI STATE

E-57/1, Ist Floor (Near Scholar School) Abul Fazal Enc. Jamia Nagar Okhla, New Delhi-110025 - E-mail : jamiatahlehadeeshind@gmal.com

Editor. RAZAULLAH MADNI Printer, Publisher,& Prop. ABDULLAH

Has Published From House No.128/29, IInd Floor, Flat No. 205, Street No.15, Zakir Nagar New Delhi-110025

Printed From: M. S. Printer's Gali No.8, 145 Chauhan Bagar, Delhi-110053